بارسِ سنگ سے بارسِ مل تک

(حمایت علی شاعر کی منظوم خودنوشت سوانح حیات "آئینہ در آئینہ" کے بارے میں متنازعہ تحریریں اور اہل نظر کے تاثرات)

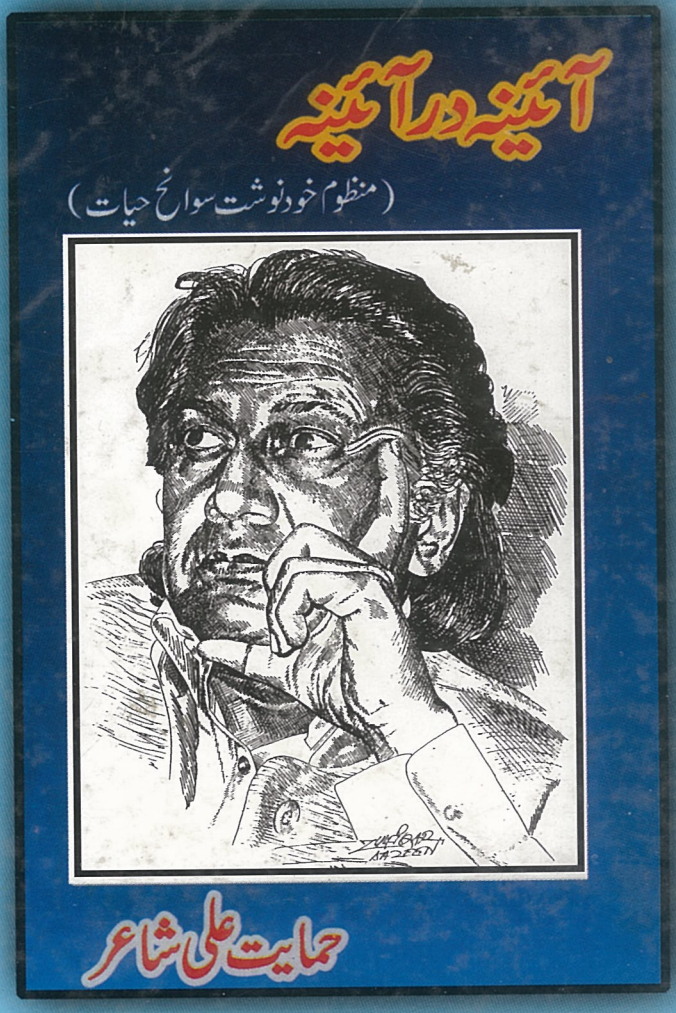

مُرتب

رعنا اقبال

([illegible])

[illegible]

"آئینہ در آئینہ" مرتبہ سحر انصاری

مطبوعہ "معاصر" (لاہور) جنوری تا جون ۲۰۰۳ء

(قابلِ مطالعہ)

(مرتبہ نے میرے "اقتدار اور دولت" کے حوالے سے آپ کا نظریہ
میں شامل کیا ہے جو میرے مجموعہ کلام میں بھی شامل ہے۔ ادریس)

بارشِ سنگ سے بارشِ گل تک

حمایت علی شاعر کی منظوم خودنوشت سوانح حیات

آئینہ در آئینہ

کے بارے میں متنازعہ تحریریں اور اہلِ نظر کے تاثرات

مُرتب

رعنا اقبال

ندا پبلیکیشنز

کراچی

جملہ حقوق بحق مرتب محفوظ ہیں

اشاعت : 2002ء
کمپوزنگ : سعدیہ رحیم
قیمت : 50روپے

ندا پبلیکیشنز

اے-307، بلاک 14، شادمان ا
نارتھ ناظم آباد ٹاؤن-کراچی
فون : 6991478

ان کے نام

جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

پتھر

کلام ○ بھرتری ہری
مترجم ○ یوسف ناظم

گرچہ بے جان ہے، بے حس ہے، مگر پتھر بھی
سرخ ہو جاتا ہے، غصے سے دہک اٹھتا ہے
جب بھی سورج کی شعاعیں اسے گرماتی ہیں

پھر یہ کس طرح سے ممکن ہے کہ کوئی انسان
تمکنت جس میں ہو، خودداری ہو
کوئی دشنام سنے
تہمت و الزام سنے
اور خاموش رہے

کیا وہ پتھر بھی نہیں؟
کیا وہ اس سے بھی گیا گزرا ہے؟

ترتیب

پس آئینہ	رعنا اقبال	۱۵
ہدیہ خلوص (نظم)	جگن ناتھ آزاد	۲۶
زبردست کتاب (خط)	شمس الرحمٰن فاروقی	۲۷
حرفِ صداقت (خط)	نوشاد نوری	۲۸
متنازعہ اشعار	حمایت علی شاعر	۲۹
نازک مسئلہ	یاور امان	۳۰
وہ بات.....	ضیاء شاہد ضیاء	۳۱
مارچ پاسٹ ۷۱ء (نظم)	حمایت علی شاعر	۳۳
LITERAMA	صبا اکرام	۳۴
WHY THIS CHANGE	ڈاکٹر محمد رضا کاظمی	۳۵
شاعر سے شکوہ (نظم)	عبدالحمید ساقی	۳۷
آئینہ در آئینہ بے چہرگی	کوثر علی صدیقی	۴۰
جناب شیخ کا نقشِ قدم.....	مدیر ''بساطِ ادب''	۴۲
خودنوشت اور غیر بنگالی	ابن عظیم فاطمی	۴۳
تظمین (آئینہ در آئینہ)	نورالدین موج	۴۵
مدیر ''تکبیر'' کے نام	حمایت علی شاعر	۴۷
مدیر ''جسارت'' کے نام	حمایت علی شاعر	۴۸
بے چہرگی (نظم)	یاور امان	۵۰

ایک بیان	عبدالرازق خان	۵۱
ایک خط	رعنا اقبال	۵۲
منفی اثرات	شاہین (کینیڈا)	۵۴
جواب آں غزل	حمایت علی شاعر	۵۶
ایک خط (بجنگ آمد)	نکہت بریلوی	۶۰
ایک خط اور	شاہین (کینیڈا)	۶۳
ایک طویل خط	ڈاکٹر محمد رضا کاظمی	۶۳
شاہین کے نام	حمایت علی شاعر	۶۷
رضا کاظمی کے نام	حمایت علی شاعر	۶۹
میرا کوئی جھگڑا نہیں	آفاق صدیقی	۷۵
شاعر کی حمایت نہیں.....	ڈاکٹر صابر آفاقی (کشمیر)	۷۶
دو باتیں (صابر و آفاق سے)	حمایت علی شاعر	۷۷
شاعر کو سلام (نظم)	احمد رئیس	۸۱
حمایت کی حمایت	ستیہ پال آنند (امریکہ)	۸۳
اہلِ نظر کے تاثرات	(''افکار'' سے ماخوذ)	۸۳

محمد احمد سبزواری (کراچی)، اکرام بریلوی (کینیڈا)، محمد خالد اختر (کراچی)، آفاق صدیقی (کراچی)، پروفیسر ضیاء (کینیڈا)، اقبال متین (نظام آباد۔ بھارت)، نور بجنوری (اسلام آباد)، طاہر نقوی (کراچی)، جمیل ملک (راولپنڈی)، محسن احسان (پشاور)، علی امام (لاہور)، یوسف ناظم (بمبئی)، پروفیسر ساجدہ زیدی (علیگڑھ)، نقاش کاظمی (کراچی)، ستیہ پال آنند (امریکہ)، جگن ناتھ آزاد (دہلی)، رام لال (لکھنو)، خالد پروین درانی (دمام)، رفعت سروش (دہلی)، اکبر حیدر آبادی (برسٹل۔ برطانیہ)،

ڈاکٹر مظفر الدین فاروقی (شکاگو)' ایس۔ام۔رحمان (ڈیلس۔امریکہ)' خالدہ درانی (دمام)'
سید قمر حیدر قمر (جدہ۔سعودی عرب)' اکرام بریلوی (کینیڈا)' شفیقہ فرحت (بھوپال)' وزیر احمد شان (کراچی)'
مظہر امام (دہلی)' سرشار صدیقی (کراچی) سرفراز تبسم (گوجرانوالہ)' الطاف فاطمہ (لاہور)'
ڈاکٹر یونس میر (ڈربن۔جنوبی افریقہ)' مشتاق شاد (میر پور۔آزاد کشمیر) جمیل الدین عالی (کراچی)'
تنہا نما پوری (کرناٹک)' شہپر رسول (دہلی)' جاوید زیدی (ہیوسٹن)' ن۔م۔نیازی (سکھر)'
احمد سعدی (ڈھاکہ۔بنگلہ دیش)' انیس شاہ جیلانی (محمد آباد۔صادق آباد)' محمد خالد اختر (کراچی)'
عبدالقوی ضیاء (کینیڈا)' پروفیسر ڈاکٹر عطیہ خلیل عرب (کراچی)' قیصر نجفی (کراچی)' سلطانہ مہر (لاس اینجلس)'
رفعت سروش (دہلی)' رؤف خیر (حیدر آباد دکن)' نوشاد نوری (ڈھاکہ)' سید سلیم معینی (کراچی)'
اکبر حیدر آبادی (لندن)' سلطان رشک (راولپنڈی)۔ڈاکٹر شارب ردولوی (لکھنو)

پہلی منظوم سوانح حیات	شفیع عقیل	99
ایک خط	محمد احمد سبزواری	101
آئینہ در آئینہ	ڈاکٹر اسلم فرخی	102
آئینہ در آئینہ	پروفیسر آفاق صدیقی	103
آئینہ در آئینہ	ڈاکٹر فہیم اعظمی	105
ڈاکٹر فہیم اعظمی کے نام خط	حمایت علی شاعر	134
عکس شاعر	رعنا اقبال	148
آئینہ در آئینہ (تقریب رونمائی)	رپورٹ○امریکہ اور کینیڈا	157
آئینہ در آئینہ (تقریب رونمائی)	رپورٹ○حیدر آباد	158
حمایت علی شاعر ایک نظر میں	رشید شکیب	159
versified autobiography	Hasan Abedi	168
versifing One's life	Akhtar Payami	170
An Overview	Ikram Barelvi	172

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جناب حمایت علی شاعر

اعزاز : صدارتی اعزاز برائے حسنِ کارکردگی

شعبہ : ادب

دورِ حاضر کے ممتاز اردو شاعر جناب حمایت علی شاعر ۱۹۲۶ء میں پیدا ہوئے۔ آپ نے ۱۹۴۸ء میں بطور صحافی اپنی پیشہ ورانہ سرگرمیوں کا آغاز کیا لیکن بعد ازاں تعلیم و تدریس کے شعبے سے وابستہ ہو گئے اور ۱۹۸۶ء میں سندھ یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے ریٹائر ہوئے۔

اگرچہ اوائل عمر ہی میں آپ نے شاعر کے طور پر شہرت و مقبولیت حاصل کر لی تھی لیکن ۱۹۵۶ء میں آپ کے پہلے شعری مجموعہ 'آگ میں پھول' کی اشاعت کے ساتھ ہی ادبی حلقوں میں آپ کا شمار اپنے دور کے صفِ اول کے نوجوان شعرا میں ہونے لگا۔ اس کتاب پر آپ کو ۱۹۵۹ء میں صدارتی ایوارڈ دیا گیا۔ اس وقت سے اب تک آپ کے مزید پانچ شعری مجموعے منظرِ عام پر آ چکے ہیں جن میں سے دو انعام یافتہ ہیں۔

خیال کی اثر انگیزی، دلکش اظہار اور مسحور کن الفاظ سے مزین حمایت علی شاعر کی شاعری جدید رجحانات اور اردو کی اعلیٰ شعری روایت کے نہایت حسین امتزاج کی نمائندگی کرتی ہے۔

جناب حمایت علی شاعر کو نثر نگاری میں بھی قدرت حاصل ہے اور آپ کی تین کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ آپ نے متعدد کتابوں کا ترجمہ کیا اور پی ٹی وی اور ریڈیو پاکستان کے لیے کھیل لکھے۔ آپ فلمی صنعت کے ساتھ بھی بطور گیت و مکالمہ نگار، کہانی نویس، پروڈیوسر اور ہدایت کار وابستہ رہے ہیں۔ آپ متعدد قابلِ رشک ادبی اور فلمی ایوارڈ حاصل کر چکے ہیں۔

ادب کے شعبے میں آپ کی نمایاں خدمات کے اعتراف میں صدرِ اسلامی جمہوریہ پاکستان نے جناب حمایت علی شاعر کو صدارتی اعزاز برائے حسنِ کارکردگی عطا کیا ہے۔

مقام : اسلام آباد

تاریخ : ۲۳ر مارچ ۲۰۰۲ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

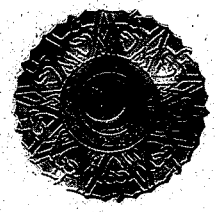

میں بحیثیت صدرِ اسلامی جمہوریۂ پاکستان

جناب حمایت علی شاعر

کو ادب کے شعبہ میں نمایاں کارکردگی کے اعتراف میں

صدارتی اِعزاز برائے حُسنِ کارکردگی

عطا کرتا ہوں۔

جنرل
(پرویز مشرف)
صدر

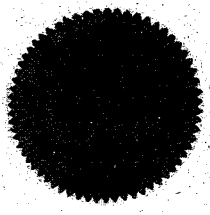

مقام: اسلام آباد
تاریخ: ۸ محرم الحرام ۱۴۲۳ھ
۲۳ مارچ ۲۰۰۲ء

صدر پاکستان جنرل پرویز مشرف، حمایت علی شاعر کو اعلیٰ ادبی خدمات پر صدارتی ایوارڈ برائے "حسن کارکردگی" عطا کر رہے ہیں۔(23 مارچ 2002ء)

سابق صدر پاکستان سردار فاروق احمد خان لغاری' حمایت علی شاعر کو (مجموعہ ءکلام) "ہارون کی آواز" پر ڈاکٹر علامہ اقبال ایوارڈ عطا کر رہے ہیں۔(اسلام آباد--1993ء)

عالمی اردو کانفرنس (دہلی) کی جانب سے موسیقار اعظم نوشاد' حمایت علی شاعر کی ادبی خدمات کے اعتراف میں "مخدوم محی الدین عالمی ایوارڈ" عنایت کر رہے ہیں (13 فروری 1989ء--- دہلی)

VILLAGE OF BOLINGBROOK

Proclamation

HIMAYAT ALI SHAIR

HONORARY CITIZEN OF BOLINGBROOK

FRIDAY, DECEMBER 29, 1995

WHEREAS, Himayat Ali Shair, a resident of Pakistan, has visited many places in the world and currently touring the United States, specifically Bolingbrook, Illinois; and

WHEREAS, he is recognized for his inspirational poetry, music, the publishing of a book starred in Pakistan movies and is regarded best for what he has done for the

WHEREAS, it is appropriate that the Village of Bolingbrook, along with the Pakistani-American community join together to recognize the artistic contributions of Himayat.

NOW, THEREFORE, I, Roger C. Claar, Mayor of the Board of Trustees of the Village of Bolingbrook, Will and DuPage Counties, Illinois, do hereby recognize the efforts of Himayat Ali Shair, welcome him as an "HONORARY CITIZEN OF BOLINGBROOK" and present the "KEY TO THE VILLAGE", a Bolingbrook Flag, and Pin to him and urge all our residents to join together to celebrate this visit from our honored guest.

In Witness Whereof, I have hereunto set my hand and caused the Seal of the Village of Bolingbrook to be affixed.

Done this 29th day of December, 1995

Roger C. Claar

Roger C. Claar
Mayor

29 دسمبر 1995ء کو بولنگ بروک میں منعقدہ تقریب میں میئر راجر سی کلئیر نے جو "سپاس نامہ" پیش کیا۔

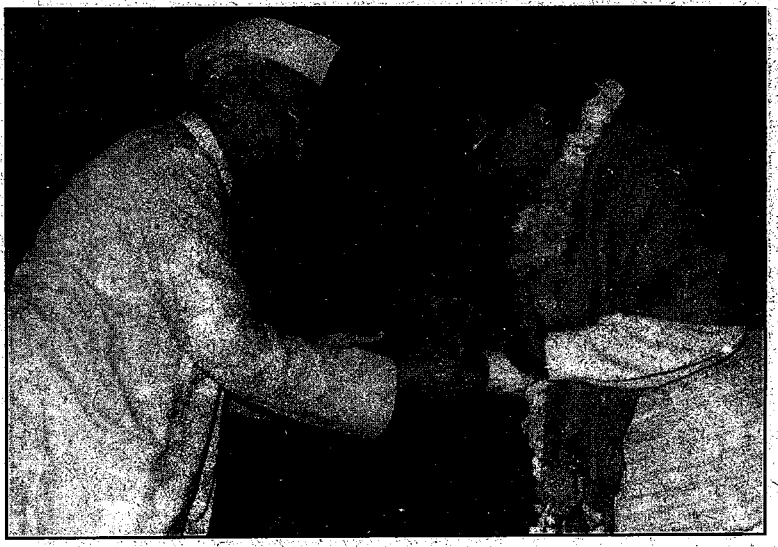

مہاراشٹر (انڈیا) کے مشہور بزرگ رہنما مشری گوبند اس شراف، حمایت علی شاعر کو سرسوتی بھون کالج اورنگ آباد میں "سرسوتی ایوارڈ" پیش کر رہے ہیں۔

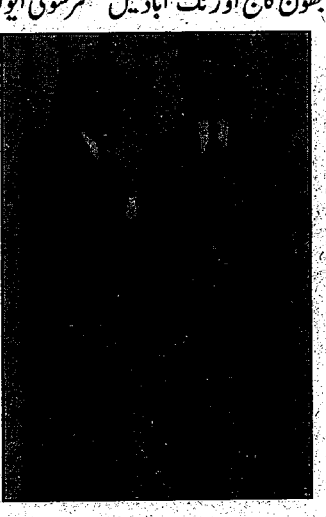

بولنگ بروک (شکاگو) کے میئر راجر سی کلئیر، حمایت علی شاعر کو امریکہ کی اعزازی شہریت اور شہر کی چابی پیش کر رہے ہیں

نگار ایوارڈز برائے بہترین نغمہ نگار

1- کسی چمن میں رہو تم بہار بن کے رہو
(1962ء- فلم آنچل)

2- نہ چھڑا سکو گے دامن (1963ء- فلم دامن)

مصور ایوارڈ

1- جب رات ڈھلی تم یاد آئے (1964ء- فلم کنیز)

(نیویارک میں جشن حمایت علی شاعر)

14 نومبر 1998ء کو حلقہ فن و ادب شمالی امریکہ کے زیر اہتمام جشن حمایت علی شاعر، حضرت احمد ندیم قاسمی کی صدارت میں منایا گیا۔ منصورہ احمد اور شاہدہ نسیم سالک بھی شریک محفل ہیں۔

14 جولائی 1996ء کو ہوٹل آواری ٹاور (کراچی) میں مجلّہ شخصیت "حمایت علی شاعر نمبر" کی تقریب رونمائی (صدر) جمیل الدین عالی (مرتب) انور جبیں قریشی اور (نگراں) شفیق الزماں نمایاں ہیں۔

پسِ آئینہ

رعنا اقبال

فیض احمد فیض نے 1951ء میں ''مقدمہ سازش راولپنڈی'' کے الزام کے حوالے سے ایک شعر کہا تھا۔

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہیں
وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

یہ اور بات کہ حسین شہید سہروردی کی وکالت کے باوجود انہیں اور ان کے ساتھیوں کو چار سال قید کی سزا سنادی گئی۔ اس دوران ان کے معرکہ آرا مجموعہ کلام ''دست صبا'' اور زنداں نامہ'' شائع ہوئے اور اپنی بیگم ایلس فیض کے نام خطوط کا مجموعہ ''صلیبیں مرے دریچے میں'' بھی اسی دور کی یادگار ہے۔

یہ باتیں اس لئے میرے ذہن میں آئیں کہ موجودہ دور کے ایک ممتاز شاعر حمایت علی شاعر کو کم وبیش اسی صورت حال کا سامنا کرنا پڑا اور اس کا سلسلہ اس وقت شروع ہوا جب امن عالم کے موضوع پر تقریباً تین سو اشعار پر مشتمل ان کی طویل افسانوی نظم ''بزّال سے کوریا تک'' جو 1952ء اور 1953ء کے دوران لکھی گئی اور کراچی کے مختلف رسائل ''برگِ گل'' 1953ء (اردو کالج میگزین۔ ایڈیٹر۔ ابنِ انشاء اور اے۔ آر۔ ممتاز) ''مشرب'' مئی 1953ء (اختر انصاری اکبر آبادی) ''روح ادب'' 1953ء (پروفیسر ممتاز حسین) ''سیارہ'' ستمبر 1953ء (پروفیسر ممتاز حسین) نیا دور 4-3 (ڈاکٹر جمیل جالبی) میں قسط وار شائع ہوتی رہی۔ پھر مکمل طور پر ''شاہراہ'' دہلی (زیر ادارت۔ واامق جونپوری) کے سالنامے (ضمیمہ۔ مارچ 1954ء) میں شائع ہوئی۔ اسے حمایت صاحب کے کچھ ''کرم فرماؤں'' نے نومبر 1955ء میں شائع ہونے والی ساحر لدھیانوی کی طویل نظم ''پرچھائیاں'' کا چربہ قرار دینے کی کوشش کی۔ (ساحر صاحب نے پیش لفظ اور سردار جعفری کے دیباچے پر بھی یہی مہینہ اور سن چھپا ہوا ہے) حمایت صاحب پر یہ الزام صرف اور صرف اس بنا پر عائد کیا گیا تھا کہ ان کا مجموعہ کلام ''آگ میں پھول'' 1956 میں شائع ہوا تھا جس میں یہ نظم بھی شامل تھی چنانچہ حمایت صاحب نے جب اس کی اشاعتوں کے تاریخی حوالے دے کر ساتھ اصل حقیقت واضح کی تو یہ غبار بیٹھا۔

یہاں یہ بھی عرض کرتی چلوں کہ دونوں نظموں کا موضوع ایک تھا یعنی جنگ کے خلاف عالمی رائے عامہ کی آرزو..... اتفاق سے دونوں کی تکنیک بھی ایک تھی یعنی "Flash Back" جو اردو شاعری میں پہلی بار محترم احسان دانش نے اختیار کی تھی۔ ان کی بہت ہی مشہور و مقبول نظم "بیتے ہوئے دن" اسی تکنیک میں ہے جس کا ٹیپ کا مصرعہ تھا۔

بیتے ہوئے کچھ دن ایسے ہیں تنہائی جنہیں دہراتی ہے

ساحر صاحب نے "پرچھائیاں" تین مختلف بحروں میں لکھی تھیں جن میں ایک بحر وہی تھی جس میں محترم احسان دانش نے اپنی نظم لکھی تھی۔ (ممکن ہے ساحر صاحب کے تحت الشعور میں وہی نظم ہی ہو۔ ویسے ان کا تعلق فلم سے بھی تھا۔ فلموں میں یہ تکنیک اکثر استعمال ہوئی ہے) حمایت علی شاعر کا تعلق بھی ریڈیو اور فلم سے رہا ہے۔ ان کی پوری نظم ایک ہی بحر میں ہے اور جیسا کہ اشاعت کی تاریخوں سے ظاہر ہے کہ یہ نظم ساحر صاحب کی نظم سے تین سال پہلے پاکستان میں لکھی گئی تھی۔ دونوں نظموں میں کہانی بھی مختلف تھی اور پس منظر بھی..... حمایت صاحب کی نظم ایک تاریخی پس منظر رکھتی ہے جب کہ ساحر صاحب نے ایک "رومانی افسانہ" لکھا تھا۔ نامناسب نہ ہوگا اگر میں یہاں ان نظموں کے بارے میں ڈاکٹر وزیر آغا کے تبصرے کا اقتباس بھی پیش کر دوں۔ (ایک خط مورخہ 16 فروری 1958ء)

"طویل نظموں میں "بنگال سے کوریا تک" نہایت خوبصورت نظم ہے۔ اتفاق دیکھئے کہ بالکل اسی موضوع پر پچھلے دنوں ساحر لدھیانوی نے بھی ایک طویل نظم لکھی ہے۔ "پرچھائیاں" لیکن میری رائے میں آپ کی نظم "پرچھائیاں" سے کہیں بہتر ہے۔ "پرچھائیاں" میں ایک تو ساحر صاحب نے میٹر کو بار بار بدلا ہے جس سے نظم کی روانی کو صدمہ پہنچا ہے۔ آپ کی نظم میں یہ نقص موجود نہیں ہے۔ دوسرے ساحر صاحب نے جو کہانی پیش کی ہے نہ صرف بے حد معمولی ہے بلکہ بے ربط بھی ہے اور آخر میں اس نے وعظ کا رنگ اختیار کر لیا ہے۔ آپ کی کہانی میں لوچ ہے۔ ایک نقطۂ عروج ہے اور پھر زندگی کے مخصوص "انداز" کو طشت از بام کیا گیا ہے۔ اس نظم میں "بچی" کا کردار "امید" کے معنوں میں آیا ہے جو موجودہ خلفشار، تخریب اور بربریت کے زمانے میں انسان کا واحد سہارا ہے۔ نظم کا یہ مثبت پہلو بڑے فطری انداز میں ابھرا ہے اور یہی اس نظم کا سب سے بڑا وصف ہے۔ پھر آپ نے ساحر کی طرح اپنے افکار کو قاری پر ٹھونسنے کی کوشش نہیں کی بلکہ صرف اپنی کہانی سنائی ہے اور اس طرح قاری کی ہمدردی حاصل کی ہے۔ میں آپ کی نظم سے متاثر ہوا ہوں۔ مبارکباد قبول فرمائیے۔"

(یہ خط مختلف رسائل میں چھپ چکا ہے۔ "احوالِ واقعی" مرتبہ: مرزا سلیم بیگ، مطبوعہ 1994ء اور

''شخصیت'' (حمایت علی شاعر نمبر) مطبوعہ 1996ء میں ڈاکٹر زیر آغا کے ''عکسی خط'' کے ساتھ بھی موجود ہے)

ایک بات اور..... ''بنگال سے کوریا تک'' کے مختلف زبانوں میں ترجمے بھی ہو چکے ہیں۔

ہندوستان میں:۔

1۔FLOWER IN FLAMES (ترجمہ) پروفیسر راجندر سنگھ ورما۔ پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ۔ (انڈیا)

2۔ FLUTE AND BUGLE (ترجمہ) پرکاش چندر۔ ریزیڈنٹ ایڈیٹر ''ٹائمز آف انڈیا'' لکھنو۔ اتر پردیش (انڈیا)

(یہ تراجم پاکستان میں بھی کتابی صورت میں چھپ چکے ہیں)

3۔ ''بنگال سے کوریا تک'' (ہندی روپ) پروفیسر جی۔ این۔ نداف۔ ابوالکلام آزاد کالج' اورنگ آباد' مہاراشٹر (انڈیا)

4۔ (تلگو میں ترجمہ) ڈاکٹر دسرتی۔ حیدر آباد دکن۔ آندھرا پردیش (انڈیا)

(سنا ہے کہ بنگالی اور دوسری زبانوں میں بھی ترجمے ہو چکے ہیں)

پاکستان میں:۔

5۔ گل باہ مہ (ترجمہ) ام۔ اے۔ عالمانی' حیدر آباد سندھ۔

(حمایت صاحب کی طویل نظم ''حرف حرف روشنی'' اور ان کے منتخب کلام کا بھی انگریزی میں ترجمہ Every Word Aglow اور ہندی رُوپ ''شبد شبد پرکاش'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے)

حمایت علی شاعر نے جب بھی کوئی غیر معمولی کام کیا ''برادرانِ یوسف'' اپنا ہنر دکھاتے نظر آئے ہیں۔

1960ء میں حمایت صاحب نے ''ثلاثی'' لکھی (''ادبِ لطیف''۔ لاہور۔ ''صبا'' حیدر آباد دکن) اس کا پہلا نام ''تثلیث'' رکھا گیا تھا۔ ملاحظہ ہو سالنامہ ''نئی قدریں'' حیدر آباد۔ (فروری 1963ء) بعد میں علامہ نیاز فتح پوری' محترم اثر لکھنوی اور محترم احمد ندیم قاسمی کے مشورے سے ''فنون'' (لاہور) میں اس کا صنفی نام ''ثلاثی'' رکھ دیا گیا' اسے ''ہائیکو'' کی نقل قرار دیا جانے لگا (''اشجاع''۔ ستمبر 1963ء)۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس وقت ''ہائیکو'' کی تیکنک (5-7-5 سلے بلز) کے بارے میں بیشتر اردو شعراء واقف ہی نہیں تھے صرف نام سن رکھا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان میں یہ صنف باقاعدہ اور باضابطہ طور پر 1983ء میں جاپان کونسلیٹ کے ''ہائیکو مشاعروں'' سے متعارف ہوئی اور 18 سال گزر جانے کے بعد آج بھی کم ہی درست ——

لکھی جاتی ہے۔

حمایت صاحب کی ایک بہت ہی مقبول تمثیلی نظم ''جواب'' کو بھی ٹیگور کی بنگالی نظم کا سرقہ مشہور کیا گیا مگر جب حمایت صاحب نے اس نظم کی اولین اشاعت ''نخلستانِ ادب'' پچاس سالہ نمبر 1962ء (بھاولپور) میں اور بعد ازاں ''نئی قدریں'' فکر جدید نمبر 1966ء (حیدرآباد) میں علامہ اقبال کا فارسی مصرعہ ''تو شب آفریدی چراغ آفریدم'' اور رابندر ناتھ ٹیگور کی مذکورہ نظم کے بارے میں اپنے مطبوعہ نوٹس کے حوالے دیئے..... تب یہ تعزیئے ٹھنڈے ہوئے۔

حمایت علی شاعر نے فلمی نغمے لکھنے شروع کئے تو 1962ء میں ان کی پہلی فلم ''آنچل'' اور 1963ء میں فلم ''دامن'' کے نغمات پر انہیں بہترین نغمہ نگاری کے ''نگار ایوارڈز'' عطا کئے گئے پھر کیا تھا..... ہر قلم تلوار بن گیا۔ تین ماہ تک فلمی اخبارات ''نگار اور کردار'' میں بحثیں ہوتی رہیں۔ سرقے اور چربے سے قطع نظر ''ادب فروشی'' کے خطابات سے بھی انہیں نوازا گیا۔ ان تمام معرکوں میں ان کے ایک ''خاص دوست'' بھی اپنے رنگ و روپ کے ساتھ نمایاں ہوئے لیکن بیشتر اہلِ قلم نے حمایت صاحب کی مدافعت کی اور جھوٹوں کو ان کے گھر تک پہنچا دیا۔ یہ فلمی مباحث ایک کتابچے ''کسی چمن میں رہو'' (مطبوعہ 1964ء) میں بھی دیکھے جاسکتے ہیں جسے ''مکتبہ آگہی'' حیدرآباد نے شائع کیا تھا۔ کچھ مضامین حمایت صاحب کی کتاب ''شخص و عکس'' (مطبوعہ 1984ء) اور مرزا سلیم بیگ کی کتاب ''احوالِ واقعی'' (مطبوعہ 1994ء) میں بھی شامل ہیں۔ خاص طور پر حمایت صاحب کا ایک مقالہ ''سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی'' قابلِ مطالعہ ہے جس میں موصوف نے ناسخ و غالب سے لے کر حافظ و فیض تک کئی عظیم شعراء کا ایک خاص انداز میں مطالعہ پیش کیا ہے۔ اس مقالے کی تحقیقی اہمیت بھی ہے اور ادبی و علمی بھی۔

1964ء میں حمایت علی شاعر نے فلمسازی شروع کی تو ان کی پہلی ہی فلم ''لوری'' باکس آفس پر سپر ہٹ ثابت ہوئی۔ پھر انہوں نے ''منزل ہے کہاں تیری'' بطور ہدایت کار شروع کی تو آستینوں کے سانپ باہر نکل آئے۔ حمایت صاحب کے دیرینہ دوست اور صدارتی ایوارڈ یافتہ فلم ''اور بھی غم ہے'' کے مصنف، فلمساز دانش دیروی کو جن کی فلم کا تھیم سانگ بھی حمایت صاحب نے لکھا تھا (ملاحظہ ہو ''احوالِ واقعی'') حمایت صاحب سے بدگمان کیا گیا۔ (وہ بحیثیت تقسیم کار ''منزل ہے کہاں تیری'' کے حقوق لے چکے تھے) بات اتنی بڑھی کہ آخر ان سے کاروباری تعلق ختم ہوگیا اور فلم ادھوری رہ گئی..... اس کے بعد حمایت صاحب نے فلم ''گڑیا'' شروع کی بلیک اینڈ وھائٹ ہونے کے سبب اس میں بھی بڑے مراحل پیش آئے۔ بالآخر 1975ء میں انہوں نے فلم انڈسٹری چھوڑ دی اور 1977ء سے سندھ یونیورسٹی میں پڑھانے لگے۔

سندھ یونیورسٹی کا فسانہ بھی دلچسپ ہے۔ حمایت علی شاعر کی بڑی صاحبزادی جاوداں میر نے کراچی یونیورسٹی سے اسلامیات میں ام۔ اے کیا تھا۔ شادی کے بعد وہ اپنے شوہر کے ساتھ حیدرآباد چلی گئیں۔ جاوداں نے اپنے والد سے کہا کہ سندھ یونیورسٹی سے اسے فیلوشپ مل جائے تو وہ ڈاکٹریٹ کرلے گی۔ ان دنوں شیخ ایاز وائس چانسلر تھے۔ حمایت صاحب نے ان سے بات کی۔ ایاز صاحب نے نہ صرف فیلوشپ دلوادی بلکہ حمایت صاحب کو بھی مشورہ دیا کہ وہ یونیورسٹی میں آجائیں۔ جیسے ہی حمایت صاحب شعبہ اردو میں استاد مقرر ہوئے اخبارات میں مراسلہ بازی شروع ہوگئی۔ نہ صرف حمایت صاحب کے بارے میں بلکہ شیخ ایاز کے خلاف بھی۔

شیخ ایاز ذوالفقار علی بھٹو کے زمانے میں وائس چانسلر بنے تھے..... یہ ضیاء الحق کا زمانہ تھا۔ اس دور کا ایک مراسلہ ملاحظہ فرمایئے جو اکتوبر یا نومبر 1977ء میں روزنامہ ''جسارت'' کراچی میں شائع ہوا تھا۔

بنام وزارت تعلیم حکومتِ پاکستان

''یہ ہمارے ملک کی بدقسمتی ہے کہ سابقہ حکومت نے تعلیم و تدریس کے مقدس شعبوں میں بھی سیاسی بنیادوں پر تقرریاں کیں جس کے باعث تعلیمی ڈھانچہ بری طرح متاثر ہوا۔ سیاسی بنیاد پر تقرری کا سب سے بڑا ثبوت سندھ یونیورسٹی میں وائس چانسلر کے عہدے پر شیخ ایاز کا تقرر ہے۔ لیکن افسوس تو اس بات کا ہے کہ حال ہی میں ایک مشہور ترقی پسند شاعر حمایت علی شاعر کا تقرر سندھ یونیورسٹی میں بحیثیت استاد کیا گیا ہے۔ آخر ان کا تقرر کس بنیاد پر کیا گیا ہے؟ اول تو ان کے پاس کوئی اعلیٰ ڈگری نہیں ہے دوسرے ان کی شخصیت اس قابل نہیں ہے کہ وہ نوجوانوں کی تربیت کرسکیں۔ ان حقائق کے پیش نظر میں متعلقہ حکام سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ حمایت علی شاعر کی تقرری کے احکامات واپس لیں کیونکہ ملک کو صرف ایسے قابل نوجوانوں کی ضرورت ہے جن کے دل سوشلسٹ نظریئے کے بجائے اسلام کی روشنی سے منور ہوں۔'' (خالد ہاشمی۔ جہانگیر روڈ' کراچی)

مخالفین کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ حمایت صاحب کتنے تعلیم یافتہ ہیں۔ حمایت علی شاعر نے 1964ء میں سندھ یونیورسٹی ہی سے ادبیات میں ام۔ اے کیا تھا اور قبل ازیں سچل سرمست کالج حیدرآباد میں کچھ عرصہ پڑھا بھی چکے تھے۔

ان کے بارے میں یہ غلط فہمی کہ وہ کوئی اعلیٰ ڈگری نہیں رکھتے شاید عام شعراء اور بالخصوص فلمی شعراء کے حوالے سے پیدا ہوئی ہوگی۔ ویسے انہوں نے اپنے نام کے ساتھ کبھی کسی عہدے یا

ڈگری کا ''لاحقہ'' نہیں لگایا یہاں تک اپنی خاندانی فضیلت ''سید'' کی نسبی اہمیت جانتے ہوئے بھی ہمیشہ خود کو صرف ''حمایت علی شاعر'' لکھا۔ ایسے لوگوں کو یہ سزا تو ملنی چاہیے۔ کیا خیال ہے آپ کا؟ حمایت صاحب کی سادہ مزاجی انکسار اور ''نمائشی آرائشوں'' سے پاک رویہ ان کی شخصیت کو اپنے ہم عصروں میں بھی نمایاں ہونے نہیں دیتا۔ یہی سبب ہے کہ ہر شخص ''زبان دراز'' ہو جاتا ہے اسی زمانے کی ایک مثال رقم کروں۔

1983ء میں سلیم احمد کے چھوٹے بھائی شمیم احمد کے مضامین کا ایک مجموعہ ''برش قلم'' کے نام سے شائع ہوا تھا جس میں ''باب سرخ'' کے تحت احمد ندیم قاسمی، سبط حسن، پروفیسر ممتاز حسین، شوکت صدیقی، حمایت علی شاعر، پروفیسر عتیق احمد، انور خواجہ اور شہزاد منظر کے خلاف اور ''باب زرد'' کے تحت ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر انور سدید اور سجاد نقوی کے خلاف نہایت رکیک، فحش اور گستاخانہ انداز میں اپنے ''مخصوص خیالات'' کا اظہار کیا گیا تھا۔ محترم مشفق خواجہ نے جو ان دنوں روزنامہ ''جسارت'' میں ''خامہ بگوش'' کے قلمی نام سے ایک ادبی صفحہ بہ عنوان ''ادب و ثقافت'' مرتب کرتے تھے۔ 30 مئی 1983ء کو مختلف اہلِ قلم کے بارے میں شمیم احمد کے مضامین کے کچھ اقتباسات ''سخن در سخن'' کے حوالے سے شائع کر دیئے۔ حمایت صاحب کے بارے میں ''چہ دلاور است دزدے'' کے عنوان سے (1963ء کا تحریر کردہ مگر بقول ان کے نیر مطبوعہ) ایک نہایت ہی ناشائستہ مضمون بھی ''برش قلم'' میں شامل کیا گیا تھا۔ حمایت صاحب نے (دورانِ مطالعہ کتاب کے حاشیوں میں لکھے ہوئے نوٹس کے ساتھ) ''چراغ بکف'' میں بھی اسے شامل کر دیا تاکہ قارئین کرام تصویر کا دوسرا رخ بھی دیکھ سکیں اور اصل حقیقت جان سکیں۔

حمایت صاحب نے اس مضمون کا جواب بھی ''جسارت'' میں لکھا تھا مگر اس کے جواب میں شمیم احمد کا جو شرمناک، توہین آمیز اور غیر مہذب خط اسی اخبار میں شائع ہوا..... ''خامہ بگوش'' (مشفق خواجہ) نے ''نکتہ شناسی'' سے کام لیتے ہوئے اس کے بعض الفاظ کی جگہ ''نقطے'' لگا دیئے اور ''جواب۔ الجواب'' کا سلسلہ بند کر دیا۔ مجبوراً حمایت صاحب نے شمیم احمد کے خلاف عدالت میں ''ہتک عزت'' کا دعویٰ کر دیا جو ان کے دوست اور ترقی پسند شاعر (ایڈووکیٹ) حسن حمیدی نے کیا تھا۔ ''ادب میں بے ادبی کے یہ مظاہرے'' روزنامہ ''جسارت'' کی 10، 17، اور 24 جون 1983ء کی اشاعتوں میں دیکھے جا سکتے ہیں اور یہ تمام تحریریں ''چراغ بکف'' (1984ء) میں بھی محفوظ ہیں۔ لیکن اسی دوران کچھ مشترکہ دوستوں کی سفارش پر ''سلیم احمد کی خاطر'' حمایت صاحب نے مقدمہ واپس لے لیا اور شمیم احمد کو معاف کر دیا۔

(ملاحظہ ہو کالم ''باتیں ادب کی'' باتونی (نکہت بریلوی) مطبوعہ روزنامہ ''کلیم''

مورخہ 26 اگست 1983ء اور ''احوالِ واقعی'' مرتبہ مرزا سلیم بیگ، صفحہ نمبر 261 مزید برآں حمایت علی شاعر کی کتاب ''شخص و عکس'' مطبوعہ 1984ء میں بھی ان کے مضمون ''آہ۔ سلیم احمد'' میں بھی ساری تفصیلات موجود ہیں)

حمایت علی شاعر 1986ء میں یونیورسٹی سے ریٹائر ہوئے تو ان کے چاہنے والوں نے سمجھا کہ اب ''رقابت'' کا یہ سلسلہ شاید ختم ہو جائے مگر بقول علامہ اقبال۔

جہاں میں ''اہلِ ایماں'' صورتِ خورشید جیتے ہیں
ادھر ڈوبے ادھر نکلے، ادھر ڈوبے ادھر نکلے

ادب کے یہ ''اہلِ ایماں'' بھی اپنی مثال آپ ہیں۔ 1992ء میں حیدرآباد کے مقبول جواں مرگ شاعر قابل اجمیری کی ایک ''چشم دید سوانح حیات'' سرگزشت ڈائجسٹ (کراچی) کے اکتوبر کے شمارے میں شائع ہوئی۔ لکھنے والے تھے ڈاکٹر ساجد امجد..... جنہوں نے خود یہ اعتراف کیا ہے کہ

''نہ کبھی قابل اجمیری کو دیکھا تھا اور نہ کبھی حیدرآباد میں رہے''

مگر حمایت صاحب کے ایک ''خاص دوست'' نے قابل اجمیری کے انتقال (اکتوبر 1962ء) کے 30 سال بعد انہیں ایسے افسانے سنائے کہ حمایت صاحب کے اشعار میں قابل صاحب کی روح بول اٹھی:

کیوں بناتے ہو میرا افسانہ
بات کرنا ہے تو کھری کیجئے
اپنی شہرت کے واسطے رسوا
یوں نہ میری سخن وری کیجئے
آدمی اپنے بل پہ جیتا ہے
کس لئے فکر ہم سری کیجئے
میرے کردار میں نہ یوں شامل
اپنا ''احساسِ کمتری'' کیجئے
زندگی میں تو کچھ بھی کر نہ سکے
آیئے اب ''مجاوری'' کیجئے

(ماخوذ۔ احوالِ واقعی)

ڈاکٹر ساجد امجد کے بقول 1961ء میں ایک مشاعرہ اور ایک تنقیدی نشست حیدرآباد میں

منعقد ہوئی تھی۔ اس مشاعرے کا حمایت صاحب نے بوجوہ بائیکاٹ کیا تھا اور تنقیدی نشست میں قابل اجمیری کے دو اشعار پر ایسی تنقید کی کہ ''ایک سال بعد'' قابل صاحب کا انتقال ہو گیا۔ وہ یہ بھول گئے کہ قابل اجمیری ''دق کے مریض'' تھے انتقال سے کچھ ماہ پہلے انہوں نے کوئٹہ سینی ٹوریم کی ایک نرس سے شادی کر لی تھی۔ ڈاکٹر ساجد امجد چونکہ ام۔ بی۔ بی۔ ایس ''ڈاکٹر'' نہیں ہیں، اس لئے انہوں نے قابل صاحب کے انتقال کی وجہ ''کچھ اور سمجھ'' لی۔ بقول ڈاکٹر ساجد امجد..... ''یہ وجہ'' بھی انہیں حمایت صاحب کے ایک ''خاص دوست'' نے بتائی تھی۔ سبحان اللہ حمایت صاحب آپ کے دوستوں پر تو فخر کرنے کو جی چاہتا ہے۔

ہوئے تم دوست جس کے دشمن، اس کا آسماں کیوں ہو

چھ مہینے بعد یہ سوانح حیات جب کراچی کے ایک روزنامہ ''قومی اخبار'' میں قسط وار دوبارہ شائع ہونے لگی (5 اپریل تا 9 اپریل 1993ء) تو ان کے ایک طالب علم کی نشان دہی پر ان کی نظر سے بھی گزری۔ مجبوراً حمایت علی شاعر نے

''آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے''

کے عنوان سے ایک تفصیلی مضمون اسی اخبار میں لکھا اور نام بہ نام اس ''جھوٹے افسانے'' کی حقیقت نمایاں کر دی۔ (یہ مضمون 4 جون تا 9 جولائی 1993ء روزنامہ ''قومی اخبار'' میں قسط وار شائع ہوا اور اب ''احوال واقعی'' میں بھی محفوظ ہے)۔ سنا ہے کہ ناشر نے قابل صاحب کی یہ ''سوانح حیات'' حمایت صاحب کے مضمون اور کچھ مراسلوں کے ساتھ ''کلیات قابل'' میں بھی شائع کر دی ہے۔ اچھا ہے اہل نظر نے خود فیصلہ کر لیا ہوگا۔

حمایت صاحب نے تقریباً نصف صدی یہ عذاب جھیلے ہیں۔ ان کی منظوم سوانح ''آئینہ در آئینہ'' (جو ساڑھے تین ہزار اشعار پر مشتمل ہے) میں بھی ان گروہ بندیوں اور اس ''مخصوص دوست'' کی کارگزاریوں کا اشارتاً تذکرہ ملتا ہے۔ ادب کے سنجیدہ حضرات نہ صرف اس شخص کو جانتے ہیں بلکہ اس کی ''عادات'' سے باخبر بھی ہیں۔ دراصل یہ ایک نفسیاتی مرض ہے۔ اس لئے اس پر کوئی تبصرہ فضول ہے لیکن وہ حضرات جو ''آئینہ در آئینہ'' میں مشرقی پاکستان کے ''بنگلہ دیش'' بن جانے اور حمایت صاحب کے تجزیئے پر ''چراغ پا'' ہیں..... وہ شاید تاریخ آشنا نہیں، وہاں جو کچھ ہوا اس کے محرکات تمام اہل نظر پر روشن ہیں، ہر عمل کا ایک ردعمل بھی ہوتا ہے اور ایک نسل کی سزا دوسری نسل کو بھی ملتی ہے۔ اسے مکافات سے تعبیر کر سکتے ہیں اور وقت کے فیصلے سے بھی۔

حمایت صاحب نے اپنی سوانح میں ایک جگہ لکھا ہے:

اگر ہمیں فنِ تاریخ کا شعور نہیں

ہمارا اپنا بھی انجام ہم سے دور نہیں
مگر مخالفین اور سستی شہرت کے دلدادگان کا مطمع نظر تو کچھ اور رہتا ہے۔ بقول کسے:

بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا

1998ء میں ایک نام نہاد ادبی پندرہ روزہ ''بساطِ ادب'' نے ''آئینہ در آئینہ'' کے خلاف مراسلہ بازی شروع کر دی تھی۔ پھر اس میں طنزیہ اور ہجویہ نظمیں چھپتی گئیں اور مختلف گھناؤنی الزام آرائیوں کا سلسلہ اردو اور انگریزی اخبارات میں تقریباً ایک سال تک چلتا رہا۔ انہیں ''اسلام دشمن اور ہندوستان کا ایجنٹ'' تک لکھ دیا گیا۔ یہ ساری تحریریں میں نے اس کتاب میں یکجا کر دی گئی ہیں تاکہ اہلِ ادب ''پس آئینہ'' بھی دیکھ سکیں۔ حمایت صاحب نے ہر مراسلے کا جواب تو نہیں دیا مگر ہفتہ وار ''نکبیر'' اور روزنامہ ''جسارت'' میں چھپے ہوئے مراسلوں کے جوابات دیئے۔ یہ سوانح حیات چونکہ ماہنامہ ''افکار'' میں اگست 1995ء سے ستمبر 1999ء تک قسط وار شائع ہوتی رہی تھی اس لئے بعض معترضین کے جوابات ''افکار'' ہی میں دے دیئے گئے ویسے اہل فکر و نظر نے اس منظوم سوانح کو پسند بھی بہت کیا۔ اردو شاعری میں چونکہ یہ پہلا تجربہ تھا اس لئے اہلِ ادب نے حمایت صاحب کے اس کارنامے کی پذیرائی بھی کی۔ یہ چونکہ پاکستان میں لکھی جانے والی طویل ترین نظم ہے جو بقول حمایت علی شاعر

آپ بیتی ہے یہ اک بکھرے ہوئے انسان کی
''آئینہ در آئینہ'' تاریخ پاکستان کی

اس لئے اس کی ایک منفرد حیثیت بھی ہے۔

حمایت علی شاعر نے ساری زندگی ایسے منفرد کام کئے ہیں۔ انہوں نے ادب کے کسی ایک پیرائے کو ذریعہ اظہار نہیں بنایا۔ قرطاس ہو یا اسکرین، تحریر ہو یا تقریر، ادب کی ہر صنف (افسانہ، ڈرامہ، شاعری، تنقید یا تحقیق) ہر شعبے میں نت نئے زاویوں سے خود کو آزمایا ہے۔ ان کے کارناموں کا اگر ایک سرسری جائزہ بھی لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے کن مشکل اور صبر آزما مراحل میں کیسے کیسے تخلیقی اور فن کارانہ تجربات کیے اور سرخرو ہوئے۔

(لوٹ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو)

ایک مصرعہ ایک نظم (ادب لطیف، فروری 1952ء) طویل افسانوی نظمیں ''شعلہ بے دود'' (ادب لطیف۔ لاہور، جولائی 1952ء اور ''بنگال سے کوریا تک'' (شاہراہ دہلی مارچ 1954ء) تصویری نظمیں ''اردو اور بابائے اردو'' (اشجاع۔ کراچی۔ اگست 1959ء) یک رکنی غزلیں۔ ''فاعلاتن'' (لیل و نہار لاہور، جولائی 1959ء) بحروں میں تجربے (تاک دھنا دھن۔ تین بار)

''افکار''۔فروری 1960ء بے شمار مختصر تمثیلی نظمیں (''ادب لطیف'' سالنامہ 1962ء اور دیگر رسائل) ''شکست کی آواز'' (ایک کرداری منظوم تمثیل۔ چھ سو مصرعے) مطبوعہ ''فنون'' لاہور 1965ء۔ریڈیائی منظوم و منثور ڈرامے (طبع زاد اور سندھ کی لوک کہانیاں) غنایئے (بدلتے زاویئے اور نوید انقلاب) اسٹیج ڈرامے اور مختصر ترین صنف سخن ''ثلاثی'' سے لیکر طویل ترین منظوم سوانح حیات ''آئینہ در آئینہ'' تک انہوں نے ہمہ رخ اور ہمہ جہت تخلیقی کام کیا ہے۔ہمارے دور میں ایسی مثالیں کم ہی نظر آتی ہیں۔14 جولائی 1996ء کو مجلّہ ''شخصیت'' کا (618 صفحات پر مشتمل) حمایت علی شاعر نمبر شائع کیا گیا تھا اس میں بھی ان کی علمی اور ادبی خدمات کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ پروفیسر عبدالقوی ضیاء نے ایک انگریزی کتاب THE SCHOLAR POET کے نام سے بھی مرتب کی ہے۔ان کی مطبوعہ شعری کتابیں ''آگ میں پھول''، ''مٹی کا قرض''، ''تشنگی کا سفر''، ''ہارون کی آواز'' اور ''چاند کی دھوپ'' ہیں۔

نثری کتابیں:

''شیخ ایاز'' (شخص و شاعر)، ''شخص و عکس'' (مقالات و مباحث) ''کھلتے کنول سے لوگ'' (دکن کے اہلِ قلم)، ''کچھ پیش رو کچھ ہمسفر'' اور (تحقیقی کتاب) ''عقیدت کا سفر'' (سات سو سالہ نعتیہ شاعری کا انتخاب) ''حرف حرف روشنی'' (طویل نظم اور منتخب کلام) ''دودِ چراغ محفل'' (مختلف شعراء کا منتخب کلام)، سبھی حمایت صاحب کے جوہر تخلیق ان کی علمی اور تنقیدی بصیرت کی آئینہ دار ہیں۔اس ''سوانح حیات'' (آئینہ در آئینہ) کی تصنیف کے دوران جو سنگ باریاں ہوئیں اور جو پھول نچھاور کئے گئے میں نے ایک تاریخی یادگار کے طور پر ان سب کو چن لیا اور ''بارش سنگ سے بارش گل تک'' کے نام سے محفوظ کر دیا۔بقول فیض صاحب

غم جہاں ہو غم یار ہو کہ تیر ستم
جو آئے آئے کہ ہم دل کشادہ رکھتے ہیں

ہر تخلیق کار کا یہ مقدر ہوتا ہے اور بالخصوص ان اہلِ کمال کا جو قدرے مختلف کام کرتے ہیں۔ فیض صاحب نے کس کرب کے ساتھ ان اہلِ کمال کی تصویر کھینچی ہے۔

گھر رہیے تو ویرانی دل کھانے کو آوے
رہ چلیے تو ہر گام پہ غوغائے سگاں ہے

حمایت صاحب نے تنگ آ کر کبھی یہاں تک کہہ دیا تھا کہ

جینا بھی اک الزام ہے مرنا بھی اک الزام
اے کاش ہم اس ملک کے فنکار نہ ہوتے

مگر یہ ملک انہیں اپنی زندگی سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ اپنی طویل نظم ''حرف حرف شبنم'' میں انہوں نے اپنے بچوں کو جو نصیحت بلکہ وصیت کی وہ خود ان کی وسیع النظری، کشادہ دلی اور آملی ظرفی کی دلیل ہے۔

مرے لہو کے چراغو، مرے جگر پارو
سنو، یہ میری نصیحت بھی ہے، وصیت بھی
میں آج تم میں ہوں موجود، کل نہیں ہوں گا
مگر جو تم ہو تو میں ہوں سدا سلامت بھی
مجھے جو غم ہے تو اتنا کہ اپنے ہی گھر میں
تمہارا ورثہ ہے، میرا عذابِ ہجرت بھی

O

مرے لہو کے چراغو، مرے جگر پارو
تمہیں زمین پہ رہنا ہے، آسماں کی طرح
سمیٹنا ہے ہر اک غم کو اپنے دامن میں
کشادہ ظرفی قلبِ پیمبراں کی طرح
ملا ہے جو بھی تمہیں میری زندگی کے عوض
عزیز رکھنا ہے ''اپنی متاعِ جاں'' کی طرح''

اور پھر وہ دعا کرتے ہیں

مرے وطن مری ہر اک دعا ہے تیرے لئے
مرے خدا سے مری التجا ہے تیرے لئے
تجھے وہ غم نہ ملے، جو مرے نصیب میں ہے

آخر میں انہیں کے اس شعر پر میں اپنا مضمون ختم کرتی ہوں۔

یہ سنگ زنی میرے لئے بارشِ گل ہے
تھک جاؤ تو کچھ سنگ بدستِ دگراں اور

.....

جگن ناتھ آزاد

(جموں کشمیر)

ہدیہ خلوص

(حمایت علی شاعر کی منظوم سوانح حیات کی تکمیل پر)

میرے عزیز دوست ''حمایت'' کی زندگی
کیا ہے اگر نہیں ہے وہ لبریز شہد و قند
اس کا حسین لہجہ اور اس کی یہ داستاں
قاری وہ کون ہے کہ نہیں ہے جسے پسند
اس داستان شوق میں دیکھا کہ ہر جگہ
جذبات ہیں عمیق تو افکار ہیں بلند
میں اس کی داد دوں تو بھلا کس طرح سے دوں
جہل اور تابہ علم بھرے کس طرح زقند
دل تھا اسی خیال میں میرا کہ غیب سے
آئی صدا کہ جس سے ہوا شوق بہرہ مند
اس نے کہا یہ مجھ سے کہ شاعر کو یوں لکھو
ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند''

(مطبوعہ ''افکار'' فروری ۲۰۰۰ء)

زبردست کتاب

شمس الرحمان فاروقی کا ایک خط

(الہ آباد۔۱۰/جنوری ۲۰۰۲ء)

پیارے بھائی حمایت علی شاعر۔ السلام علیکم

نیا سال مبارک ہو آپ کی منظوم خودنوشت ''آئینہ در آئینہ'' علی احمد فاطمی نے مجھے پہنچادی تھی ۔شرمندہ ہوں کہ جواب لکھنے میں اتنی دیر ہوئی۔ وجہ کچھ خاص نہیں وہی سب باتیں ہم بوڑھوں کا مقدر ہوتی ہیں۔ یعنی کام کی زیادتی اور صحت کی ناسازگاری۔ اتنی ضخیم خودنوشت اور اتنے مفصل، حالات سے بھرپور اور وہ بھی منظوم..... میں نے نہیں دیکھی۔ پھر یہ کہ ساری کتاب ایک ہی بحر میں۔ (صرف چند صفحوں کو چھوڑ کر) اور کہیں بھی روانی میں کمی نہیں۔ بھلا میر، آپ کی تعریف کیا کرسکتا ہوں۔ اس وقت سب سے پہلے یہ عرض کروں گا کہ ''محاسبہ'' جیسی نظم اور خاص کر اس کا پہلا بند اگر میں کہہ لیتا تو سمجھ لیتا کہ میری زندگی کامیاب رہی۔

آپ نے ملک کی سماجی اور سیاسی تاریخ کو بھی ملحوظ رکھا ہے اور واقعات بیان کرنے میں کچھ کمی بھی نہیں کی ہے۔ اس پر کمال یہ کہ کہیں تلخی یا تنگ نظری کا اظہار نہیں ہوا۔ جگہ جگہ ہلکا پھلکا طنز ضرور ہے۔ لیکن اس سے کتاب کے حسن میں اضافہ ہوتا ہے یہ بہت بڑی بات ہے کہ آپ نے ذاتی اور سیاسی دونوں طرح کے حقائق سے آنکھ ملانے میں کہیں بھی کمی نہیں کی۔ اس زبردست کتاب کی توصیف میں جو کچھ بھی لکھوں کم معلوم ہوتا ہے۔ جگن ناتھ آزاد نے تو منظوم داد دے کر ایک حد تک قرض اتار دیا لیکن ان کی نظم میں عمومی داد ہے۔ اگر وہ ذرا وسعت سے کام لیتے تو آپ کی کتاب کے کچھ پہلوؤں کی طرف اشارہ ہوجاتا۔

مجھ سے بن پڑا تو میں ''آئینہ در آئینہ'' پر تبصرہ لکھوں گا یا کسی اور طریقے سے اظہار خیال کروں گا۔ فی الحال تو بس شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے یہ کتاب مجھے بھیجی۔ کبھی دل چاہے تو ''شب خون'' کے لئے کلام بھیجئے۔

حرفِ صداقت

نوشاد نوری (ڈھاکہ)۔ مورخہ ۱۲/ جنوری ۲۰۰۰ء

تمہاری خودنوشت جو "افکار" میں مستقل شائع ہوتی رہی ہے بہت لطف دے گئی۔ اس پر بعض پیارے بہاری برہم بھی ہوئے۔ میں بھی بہاری ہوں۔ میں نے ایک ایک حرفِ صداقت پر مبنی پایا۔ اپنی مکمل پامالی میں بہاریوں نے خود بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ سنا ہے کتابی شکل میں آ رہی ہے چھپ جائے تو مجھے آگاہ کرنا۔

آپ کا۔ نوشاد نوری

(حمیت علی شاعر کے نام خط سے اقتباس مطبوعہ سہ ماہی "روشنائی" کراچی۔ ایڈیٹر احمد زین الدین اور نکہت بریلوی۔ شمارہ جولائی تا ستمبر ۲۰۰۰ء)

آئینہ در آئینہ

(انگریزی ترجمہ)

MIRROR BY MIRROR

AN AUTOBIOGRAPHY IN VERSE

BY

HIMAYAT ALI SHAIR

TRANSLATION

JAWED ZAIDI

(HOUSTON. TEXAX. U.S.A)

متنازعہ اشعار

(مطبوعہ۔ "بساط ادب" کراچی یکم مئی 1998ء)

(منظوم خودنوشت کے کچھ اشعار)

وہاں پہ جو بھی تھے آباد "غیر بنگالی"
تھے ڈھول کی طرح ان کے بھی اندروں خالی
یہ ڈھول بجتے تھے باہر کی ضرب سے اکثر
وہ بے خبر رہے اندر کے کرب سے اکثر
ہر ایک چیخ کی بابت خیال تھا ان کا
وہ آدمی نہ تھا "چابی بھرا کھلونا" تھا
ہر اک کھلونے کی چابی تھی انڈیا میں کہیں
بنا تھی ساری خرابی کی انڈیا میں کہیں
سو انڈیا نے کیا وہ جو اس کی "خواہش" تھی
وہاں ہمارا وطن توڑنے کی سازش تھی
بالآخر اس نے چلی چال ایک ایسی بھی
کہ سانپ بھی مرے ٹوٹے نہ اس کی لاٹھی بھی

(مطبوعہ۔ ماہنامہ "افکار" مئی 1988ء سے اقتباس)

نازک مسئلہ

مدیر محترم
پندرہ روزہ بساط ادب کراچی

جناب عالی

میں آپ کی توجہ ایک نازک اور حساس مسئلے کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں' وہ مسئلہ یہ ہے کہ کراچی کے ماہنامہ "افکار" کے تازہ شمارے' مئی 1998ء میں "مارچ پاسٹ 1971ء" کے عنوان سے حمایت علی شاعر کی ایک نظم شائع ہوئی ہے' جس میں انہوں نے پاکستان کی مسلح افواج' سابق مشرقی پاکستان میں مقیم و آباد غیر بنگالیوں اور تمام محب وطن پاکستانیوں کو مطعون کیا ہے۔ اس نظم سے پاکستان کے لئے قربانی دینے والے محب وطن شہریوں اور مسلح افواج کی دل آزاری ہوئی ہے۔ یہ پاکستان اور نظریہ پاکستان کو کمزور کرنے کی ایک سوچی سمجھی سازش ہے۔ ظاہر ہے کہ کوئی غیرت مند اور سچا پاکستانی شاعر ایسا نہیں کر سکتا۔ اس میں یقیناً" پاکستان دشمنوں اور وطن عزیز کے ملکی و غیر ملکی ایجنٹوں کے منصوبے کو دخل ہے' لہٰذا ہم آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ اس کی طرف توجہ دیں اور ہمارے ساتھ حکومت سے مطالبہ کریں کہ وہ شاعری کے نام پر پاکستان اور پاکستانیوں کے خلاف اس طرح کی ہرزہ سرائی کرنے والے شاعر کو قرار واقعی سزا دے۔

آپ کا مخلص

یاور امان

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہیں

یہ مراسلہ سب سے پہلے کراچی کے ایک نام نہاد (پندرہ روزہ) "ادبی اخبار" میں 16 مئی 1998ء کو شائع ہوا۔ پھر 12 جولائی 1998ء کو روزنامہ "جسارت" کراچی میں چھپا۔ اس کے بعد یہی مراسلہ ایڈیٹر کی قطع و برید کے بعد 16 جولائی کو ہفتہ وار "تکبیر" کراچی میں شائع ہوا پھر یہی مراسلہ یکم ستمبر 1998ء کو پندرہ روزہ "بجنگ آمد" لاہور میں چھپا۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ کچھ مخصوص حضرات، جنہیں حمایت صاحب کے الفاظ میں "رقیبان روسیاہ" کہا جا سکتا ہے ایک سوچے سمجھے پروگرام کے تحت انہیں بدنام کرنے کی مسلسل کوشش کر رہے ہیں۔ حمایت صاحب نے صرف روزنامہ "جسارت" اور ہفتہ وار "تکبیر" میں جوابات دیئے اور پندرہ روزہ "بجنگ آمد" میں نکہت بریلوی نے اس مراسلے کا تفصیلی جواب دیا۔ (مرتب)

(مطبوعہ۔ پندرہ روزہ "بساط ادب" کراچی 16 تا 31 مئی 1998ء)

جناب ایڈیٹر صاحب

روزنامہ بساط ادب کراچی

محترمی!

ہم آپ کے موقر جریدے کے ذریعے حکومت پاکستان اور پاکستانی قوم کے علم میں یہ بات لانا چاہتے ہیں کہ کراچی کے ایک ادبی ماہنامہ "افکار" میں حمایت علی شاعر کی منظوم خودنوشت سوانح حیات "آئینہ در آئینہ" کے عنوان سے قسط وار شائع ہو رہی ہے، جس کی نئی 34 ویں قسط میں ایک نظم "مارچ پاسٹ 1971ء" کے زیر عنوان، مذکورہ رسالے کے شمارے مئی 1998ء میں شریک اشاعت ہے۔ اس قسط میں انہوں نے المیہ مشرقی پاکستان کے حوالے سے پاکستانی افواج کے کردار کا مذاق اڑانے کے ساتھ ساتھ وہاں آباد غیر بنگالیوں کو ایسے ڈھول قرار دیا ہے، جن کا "اندروں خالی" تھا اور جو "باہر کی ضرب" سے بجتے تھے۔ آگے چل کر تمام محب وطن پاکستانیوں کی مذمت کی گئی ہے اور عوامی لیگ، مکتی باہنی اور شیخ مجیب الرحمٰن کی پاکستان دشمن سرگرمیوں کو سراہا گیا ہے حتیٰ کہ ہندوستانی جارحیت کو بھی حق بجانب کرنے کی ایک مذموم کوشش ہے۔ ہم نے مشرقی پاکستان میں جو کچھ کیا، اس پر ہم شرمندہ یا متاسف ہرگز نہیں ہیں کیونکہ حب الوطنی کا تقاضا یہی تھا۔ ہم نے نظریہ پاکستان اور سالمیت پاکستان کے لئے ہر طرح کی قربانیاں دیں اور اگر خدانخواستہ آئندہ بھی وطن عزیز پر ایسا کوئی کڑا وقت آن پڑا تو ہم کسی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے۔ حمایت علی اگر وہاں ہوتے تو یقیناً "مکتی باہنی سے مل جاتے۔ یقیناً" ہم نے اس لئے کہا ہے کہ یہاں بھی ان کا گٹھ جوڑ سندھ کی علیحدگی پسند

قوتوں اور گروہوں سے ہے۔ یہاں اس بات کا ذکر بھی بے محل نہ ہوگا کہ 1965ء کی جنگ کے زمانے میں موصوف نے "لہو" کے عنوان سے ایک نظم کہی تھی جو پاکستانی قوم کے جذبات کی ترجمانی کرتی تھی۔ یہ نظم وہ ہر مشاعرے میں پڑھا کرتے تھے مگر کچھ دنوں بعد انہوں نے ہندوستان اور ہندوستانیوں کو خوش کرنے کے لئے اپنی اس نظم کو مسترد کردیا۔① اس لئے یہ نظم ان کے کسی مجموعہء کلام میں شامل نہیں ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ اپنے کئی اشعار میں انہوں نے پاکستان کو ایک غیر فطری اور کج نہاد ملک قرار دیا ہے۔ یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ اسلام' امت مسلمہ اور پاکستان کے بارے میں شاعر کا رویہ ہمیشہ معاندانہ اور مخاصمانہ رہا ہے' لہٰذا ہم اکادمی ادبیات' وفاقی وزارت اطلاعات اور حکومت پاکستان سے پرزور مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ اس "دریدہ دہن شاعر" پر ریڈیو' ٹی وی اور دیگر ذرائع کے دروازے بند کرے اور مشاعرے کے بہانے اس کے غیر ملکی دوروں پر پابندی عائد کرے کیونکہ پاکستان دشمنی کے سارے منصوبے غیر ممالک ہی میں بنتے ہیں' جہاں اس طرح کے لوگ ہندوستانی اور ہندوستانی نژاد لوگوں سے مل کر پاکستان کے خلاف سازشیں تیار کرتے ہیں۔ اگر ایسے لوگوں کی وطن دشمن سرگرمیوں کا بروقت تدارک نہ کیا گیا تو ان کے حوصلے بلند ہوتے جائیں گے۔

ضیاء شاہد ضیاء

① یہ نظم حمایت صاحب کے مجموعہء کلام "مٹی کا قرض" (مطبوعہ 1974ء) کے ہر ایڈیشن میں شامل ہے۔ (مرتب)

کراچی کی ادبی سیاست پر مبنی

چراغ بکف

مرتبہ

حمایت علی شاعر — مرزا سلیم بیگ

ناشر: دنیائے ادب | 624' ریگل اسکوائر صدر کراچی

مارچ پاسٹ ۱۹۷۱ء

سپاہی جنگ پر چلے ہیں کتنی آن بان سے
مدن پہ وردیاں سجائے کس عجیب شان سے
تڑپ کے دیکھتی ہے صبح جھک کے آسمان سے
جوان جارہے ہیں آج آپ اپنی جان سے
نبرد آزما ہے کون پردۂ مجاز میں
نہ جانے کتنے راز ہیں نہاں اس ایک راز میں

ہوائیں چپ فضائیں چپ زمین و آسمان چپ
خلا میں تک رہا ہے آنکھ اٹھائے ہر مکان چپ
ہجوم در ہجوم نوگ اور ہر زبان چپ
ہر ایک سمت حشر کا سماں مگر ہیں کان چپ
سے خبر سنور رہے ہیں یا بکھر رہے ہیں ہم
بڑے عجیب امتحان سے گزر رہے ہیں ہم

یہ جنگ کس کی جنگ ہے خود اس وطن سے پوچھئے
وطن سے دور ''دوستوں کی انجمن'' سے پوچھئے
جبیں جبیں پہ مضطرب شکن شکن سے پوچھئے
''خدا'' بنا ہوا ہے جو اس ''اہرمن'' سے پوچھئے
ہوائیں چیختی پھریں انارکی انارکی
یہ زرگری جنگ ہے یہ جنگ اقتدار کی

(ماخوذ ''مٹی کا قرض'' مطبوعہ ۱۹۷۴ء)

نوٹ: ''مٹی کا قرض'' کے ہندوستان و پاکستان میں اب تک چھ ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ ہر ایڈیشن میں یہ نظم موجود ہے۔ (مرتب)

(''یہ کالم اور مراسلہ'' دوبارہ ''بساطِ ادب'' کراچی میں یکم جولائی 1998ء کو شائع کیا گیا تھا)

THE LEADER

Saturday, May 30, 1998

[illegible]

BY SARA EKRAM

Monthly 'Afkar'

Afkar's May '98 issue is out. It has prose and poetic pieces from both, senior and new talents. Contributors to the short story section include Sultan Jamil Nasim, Tahir Naqvi, Shakeela Rafique, Anil Thakkar and Anwarul Haque while Jegan nath Azad, Sarshar Siddiqui, Shahee, Adeeb Sohail, Usma Jaan, Najma khan, Sabir Zahid and Umar barandi have contributed poetic pieces.

The issue also has in it's old part — 34 of Hemayat Ali Shair's serialized autobiography in poetic form. It depicts 1971 war and the fall of Dacca. Though it is artistically superb, but some of the stanzas are not in keepign with the real facts and hurt the feeligs of the non-bengalis who were settled in the earstwhile East Pakistan. A few lines are reproduced here:

'Wahan pe Jo Bhi Tahe
Abad Ghair Bengali
Thae Dhole Ki Tarah
Unke Bhi Adnroon Khali
Ye Dhole Bajte Thae
Bahar Ki Zarb Se Aksar
We Bekhabar Rahe Andar Ke karb Se Aksar'

One can not expect such lapses on the part of a poet like his calibre. Had he faced the upheaval and had experienced the shock himself he would not have said so.

(COURTSEY)

WHY THIS CHANGE OF HEART?

Dr. M.R. Kazmi (Karachi)

The Muslim(Islamabad)-Monday-15 June 1998

At This critical juncture of our existence, I wish to bring to the attention of your readers the verse-autbiography of Himayat Ali Shair in the Afkar, Karachi, (May, 1998) wherein he has defamed the Pakista Army and depicted the non-Bengali population of East Pakistan as agent of Indian.

This is not a mere distortion, but a preversion of facts. When Bengali militants and Mukti Bahini massacred non-Bengalis both before and after their liberation they charged them with being collaborators of the Pakistan Army.

Today some people who imagine that regional considerations can be different from national considerations accuse their own Army and their own citizens of protecting their own territory.

It is understandable if, Bengladesh or Indian writers depict them as terrorists or agents, but it appears strange for Pakistani writers to do so.

For long now, Political masochism has been the only so-called intellectual response to national crises, for long we have been called upon to apologise for defending our own teritory, without any one pausing to reflect that Pakistan opposed the secessionist move of the Awami League because it's own servival was at stake just for the same reason. Indian leadership blocked the independence of a United Bengal in 1947.

It is now firmly established that Quid-e-Azam had given his assent to S.H.Suharwardy's Scheme of an independent and United Bengal but Jawaharlal Nehru dissented.

If an ethnically and linguistically defined province

given the status of a nation in 1947, Other provinces would follow and princely States would hold back. Nehru however, expressed himself very crudely saying that the Hindus of Bengal would never agree to live as a permanent minority an inadvertent endorsement of the two-nation theory.

This need emphasis because Himayat Ali Shair has hinted in his lyrical poetry that Pakistan was an un-natural and perverted entity.

Himayat Ali Shair due to his frequent visits is aware that a large-scale massacre of non-racial love affair.

Another orgy of blood Shed began on March 1st, 1971 immediatetly after Gen. Yahya Khan announced postponement of the N.A. Sessions. Awami League volunteers had serial Numbers on their areas, which varied from rifles of spades.

The information Ministry of Pakistan suppressed news of the genocide to protect Bengali residents in West Pakistan, a very costly mistake as attested by Zulfiqar Ali Butto in his reply to Yakoob Malik, the Soviet representative of the Security Council.

The Army action by Pakistan has been turned as an invasion by Himayat Ali Shair, which means in effect. "If all started when he hit me back!" If the Pakistan Army made human rights violation, it also sufferd international ordium.

The West in press did report on the genocide of non-Bengalis but fleetingly and did not make in a cause octetre.

Need Pakistani authors add to this one-sided odium.

We had hitherto, praised Himayat Ali Shair from the bottom of our hearts specially for his 1965 War Poem "Lahoo", but he himself has not included it in any of his onthologies or collections. We are expected to applaud protest poetry are we not allowed to protetst against poetry which poise and defames us?

شاعر سے شکوہ (نظم)

(مطبوعہ۔ پندرہ روزہ "بساط ادب" کراچی یکم جون 1998ء)

شاعر شعلہ نوا جس کو بھی کل کہتے تھے لوگ
جس کو پڑھنے کیلئے بے چین سے رہتے تھے لوگ
آسمان فکر پر اک مہر تابندہ تھا جو
حرف حق لکھتا تھا سچوں کا نمائندہ تھا جو
قوم کی مردہ رگوں میں خون بھردیتا تھا جو
اپنے نغموں سے انہیں بیدار کردیتا تھا جو
اپنے پرکھوں کی کبھی تاریخ دہراتا تھا جو
برق بنکر سینہ باطل پہ لہراتا تھا جو
ہاں وہی شاعر جو بزم فکر و فن کی جان تھا
ہاں وہی شاعر جو قوم و ملک کی پہچان تھا
ہاں وہی شاعر لہو کا مانگتا تھا جو خراج
ہیچ تھے جس کی نظر میں مال و دولت تخت و تاج
آبروئے ملک و ملت تھا کبھی جس کا قلم
قوم کی تاریخ تھا کرتا لہو سے جو رقم
آج اس نے بیچ دی اپنے قلم کی آبرو
اپنے ہاتھوں گھونٹ ڈالا اپنی شہرت کا گلو
مصلحت کی رو میں آخر بہہ گیا اس کا قلم
رکھ نہ پایا آج وہ اپنی صحافت کا بھرم
"آئینہ در آئینہ" ہیں عکس دھندلائے ہوئے
جھوٹ کے چہرے حقیقت سے ہیں شرمائے ہوئے
دشمنان قوم کا تو عکس آئینے میں ہے
جاں نثاروں کی مگر تصویر کس زینے میں ہے
وہ صلیبیں کیا ہوئیں وہ قتل گاہیں کیا ہوئیں

موت کی جو سمت جاتی تھیں وہ راہیں کیا ہوئیں
روح فرسا منظروں کا عکس کیوں آیا نہیں
کیا لہو اہل وفا کا آپ کو بھایا نہیں
سچ تو یہ ہے آئینے پر جب بھی آجائے غبار
ہو نہیں سکتی کبھی اس میں حقیقت آشکار
کون کہتا ہے کہ سچ کا آئینہ معیار ہے
زندگی تصویر ہے اور آئینہ کردار ہے
خون کی تحریر کوئی بھی مٹا سکتا نہیں
آئینے کو آئینہ کوئی دکھا سکتا نہیں
ڈھول سے تشبیہ دینا صاحب کردار کو
کرب سے خالی بتا دینا دل غم خوار کو
سلب کرلینا کسی کے جذبہ ایثار کو
مسخ کردینا کسی تاریخ کے شہکار کو
آپ ہی بتلایئے کس کرب کا اظہار ہے
مرہم زخم جگر ہے یاکہ تازہ وار ہے
کرب سے کس وقت ان کے اندروں خالی رہے
ہاں وہی بنگال میں جو غیر بنگالی رہے
ہاں وہی جس کی وفا سے تھی وطن کی آبرو
ہاں وہی جن کے لہو سے تھے چمن میں رنگ و بو
ہاں وہی جو قائد اعظم کے پیروکار تھے
ہاں وہی جو کشتی ملت کے کھیون ہار تھے
ہاں وہی جن کا یہی مسلک یہی ایمان تھا
وہ تھے پاکستان سے اور ان سے پاکستان تھا
آج بھی کیمپوں میں آخر کس لئے محصور ہیں
کون سا وہ کرب ہے جس کرب سے وہ چور ہیں
آپ کی اس چشم پوشی کی ادا کو کیا کہوں

آنکھ کا پردہ کہوں یا وقت کا چہرہ کہوں
عصبیت کی چل رہی تھی جس گھڑی اندھی ہوا
پنجہ ظلم و ستم میں جب تھی ملت کی روا
نفرتوں کی آگ میں جب جل رہا تھا گلستاں
خانہ اہل وفا سے اٹھ رہا تھا جب دھواں
بہہ رہا تھا قریہ قریہ باوفاؤں کا لہو
لٹ رہی تھی جب حریمان وطن کی آبرو
خون کے چھینٹے پڑے تھے جب در و دیوار پر
سرخیاں ہی سرخیاں ہیں مطلع اخبار پر

گر رہی تھیں خرمن اہل وفا پر بجلیاں
اڑ رہی تھیں پرچم اسلاف کی جب دھجیاں
حق پرستوں کے لہو سے جب فضا رنگین تھی
مشرقی بازو کی حالت جس گھڑی سنگین تھی
سر ہتھیلی پر اٹھائے ہر محاذ جنگ پر
جاں نثاران وطن جس وقت تھے سینہ سپر
اس گھڑی کیا حضرت شاعر کہیں روپوش تھے
خواب کی دنیا میں تھے یا محو ناؤ نوش تھے
ملک سے باہر تھے جنگل میں کہ ویرانے میں تھے
محفل خوباں میں تھے یا آئینہ خانے میں تھے

(عبدالحمید)

آئینہ در آئینہ بے چہرگی

(مطبوعہ۔ پندرہ روزہ "بساط ادب" کراچی یکم جون 1998ء)

حمایت علی شاعر ایک مشہور و معروف شاعر ہیں۔ گذشتہ تین سال سے حمایت صاحب ماہنامہ "افکار" میں منظوم خودنوشت سوانح قلمبند کر رہے ہیں، جس کی 34 ویں قسط زیر نظر ہے۔ یہ قسط خصوصی طور پر سقوط مشرقی پاکستان کے حوالے سے ہے، جس میں اس وقت کے مقتدر سیاستدانوں، سربراہان اقتدار، فوج اور سیاسی بازیگروں کی جانب انہوں نے اشارے دیئے ہیں اور اس سیاسی خودکشی کی جانب بھی اشارے کئے ہیں، جس کی وجہ سے ملک دولخت ہوا اور قیام بنگلہ دیش کی راہیں ہموار ہو گئیں۔ جہاں تک حب الوطنی کی بات ہے تو اس کے کچھ تقاضے ہیں۔ ملک جن کی اپنے ہر وطن پرست شہری سے تقاضا کرتا ہے۔ ہمیں حمایت علی شاعر کی مذکورہ بالا نظم پڑھ کر دکھ ہوا۔ انہوں نے لاکھوں افراد کی عزت نفس کو مجروح کیا ہے، نہ جانے حمایت علی شاعر کو سابق مشرقی پاکستان کے "غیر بنگالی" ڈھول کا پول کیسے نظر آ گئے جو انہوں نے اس نظم کے چار مصرعوں میں یوں فرمایا کہ۔

وہاں پہ جو بھی تھے آباد "غیر بنگالی"
تھے ڈھول کی طرح ان کے بھی اندروں خالی
وہ ڈھول بجتے تھے باہر کی ضرب سے اکثر
وہ بے خبر رہے اندر کے کرب سے اکثر

ساری دنیا تو باہر کی ضرب سے ہی ڈھول بجاتی ہے مگر شاید ان کے ہاں ڈھول پھاڑ کر اندر کی جانب ضرب لگائی جاتی ہوگی۔ گویا ان کے ڈھول ڈھاپ ہی الگ ہیں؟ حمایت صاحب کو اس زبان درازی کی معافی مانگنی چاہئے اور آئندہ ایسی باتوں سے پرہیز کرنی چاہئے۔ انہوں نے ہمارے جیسے لاکھوں افراد کی نظر میں اپنے امیج کو بگاڑ لیا ہے۔ جو بھی کہہ کر انہوں نے تمام پاکستانیوں کو شامل کر لیا ہے اس لئے کہ موجودہ چاروں صوبوں کے لوگ بھی وہاں نوکری و تجارت کی غرض سے رہائش پذیر تھے۔ ساتھ ہی ساتھ لاکھوں بنگالی جن کا مسلم لیگ نظام اسلام پارٹی پی ڈی پی (سابق صدر جناب نوالامین) اور پیپلز پارٹی اور جماعت اسلامی سے تعلق تھا۔ پاکستان کی خیر خواہ تھے۔ وہ بنگلہ دیش بننے کے بعد قتل کر دیئے گئے یا ظلم و زیادتی کا نشانہ بنے۔ وہاں کے غیر بنگالیوں کا اندرون خالی ہوتا تو 21 فروری 1954ء میں علیحدگی کی جس

تحریک کی بنیاد پڑی جو لسانی تحریک تھی اور جس کا اختتام 16 دسمبر 1971ء کو ہوا۔ 1971ء سے بہت پہلے کامیاب ہو گئی ہوتی۔ وطنیت اگر کوئی چیز ہے اور جذبات کو انسانی معاشرے میں کوئی مقام حاصل ہے تو پاکستانیوں نے جو مدافعتی جنگ لڑی خواہ بنگالی ہوں یا اردو بولنے والے EPCAF البدر' الشمس رضاکار ہوں یا پاکستانی فوج اس پر ہر محب الوطن کو آج بھی فخر ہے کہ وہ حب الوطنی کے تقاضے تھے۔ وطن سے غداری کرنے والوں کو بوسہ نہیں لیا جتا دشمن تو صرف دشمن ہوتا ہے۔ اس کا استقبال تو نہیں کر سکتے۔ یہ ان غیر بنگالیوں کا احسان ہے' جنہوں نے افواج پاکستان کے شانہ بہ شانہ جدوجہد کر کے اپنی حب الوطنی کو مسلم الثبوت کر دیا۔ جن کے 35 ہزار نوجوان اس جنگ کی نذر ہو گئے جبکہ لاکھوں اردو بولنے والے نہتے کر کے اور قرآن پر صلح کی قسمیں لینے کے بعد بے یار و مددگار مار ڈالے گئے۔ کیا ہم 27 سال میں اپنی تاریخ بھول گئے یا اسے مسخ کرنے کے درپے ہیں۔ اس قوم کو "قرطاس ابیض" دوبارہ پڑھنی چاہئے۔ ہم سچائی اور حقیقت سننے کے لئے تیار ہی نہیں۔ ہماری یہ دوسری ہجرت اسی حب الوطنی کی سزا ہے اور بنگلہ دیش کے کیمپوں میں تبادلے کے منتظر افراد آج بھی اسی کرب کا شکار ہیں جو حب الوطنی کی سزا کے طور پر ان کو دی جا رہی ہے۔ آج بھی وہ لوگ غیر یقینی کا شکار ہو کر محصور پاکستانی بنے ہوئے ہیں' جن کے لئے یہاں کوئی ہمدردی کے دو بول نہیں بولتا' جو کوشش کرتا ہے اسے دبا دیا جاتا ہے بلکہ خون کی ندیاں بہانے کی دھمکی دی جاتی ہے' جن سے باز پرس کرنے والا بھی کوئی نہیں۔

علامہ اقبال کا یہ شعر دیکھئے یہاں کتنے اچھے معنی دے رہا ہے۔

وائے ناکامی متاع کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا

احساس زیاں اگر جاتا ہے تو قوموں کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔ اس کی فکر کرنے کی ضرورت آج بھی اس قوم کو ہے لیکن اس انداز میں نہیں جو کہ حمایت علی شاعر اور ان جیسے "ہوائی دانشوروں" کا ہے۔

اس مراسلے کا جواب شاید اس "ثلاثی" میں پوشیدہ ہے۔ (کوثر علی صدیقی)

عالم تھے باکمال تھے اہلِ کتاب تھے
آنکھیں کھلیں تو اپنی حقیقت بھی کھل گئی
الفاظ کے لحاف میں ہم محوِ خواب تھے

جناب شیخ کا نقشِ قدم.....

(بساط ادب کے اداریے کا اقتباس)

(مطبوعہ-15 جون تا 30 جون 1998ء)

گذشتہ دنوں ادارے کو بے شمار خطوط موصول ہوئے۔ یہ خطوط ایک شاعر کی منظوم خودنوشت کے اس حصے کے رد عمل میں تھی، جس میں 1971ء سے قبل مشرقی پاکستان میں رہنے والے غیر بنگالیوں کے بارے شاعر نے اظہار خیال کیا تھا۔ ان اشعار سے بے شمار افراد کی دل آزاری ہوئی تھی۔ یہ منظوم خودنوشت ماہنامہ "افکار" میں قسط وار شائع ہو رہی ہے۔ وہ اشعار جو لوگوں کی دل آزاری کا باعث بنے "افکار" کے مئی 1998ء کے شمارے میں شائع ہوئے تھے۔ اس حوالے سے "بساط ادب" کو جو خطوط موصول ہوئے ہیں، ان کے لکھنے والے متاثرین میں شامل ہیں۔ کچھ خطوط اور نظمیں گذشتہ شماروں میں چھپ چکی ہیں۔ خطوط اور منظوم رد عمل کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ ادارے کے لئے یہ امر انتہائی مشکل ہے کہ اس قدر طویل خطوط اور منظوم احساسات کو "بساط ادب" جیسے مختصر سے پرچے میں جگہ دے۔ دوسری بات یہ ہے کہ مذکورہ مسئلے پر ہم اچھا خاصا مواد پہلے ہی شائع کر چکے ہیں۔ ہمارے بعض احباب کا مشورہ ہے کہ اب اس مسئلے پر مزید کچھ شائع کرنا فی الحال ضروری نہیں، لہٰذا شائقین بساط ادب سے گزارش ہے کہ نزاعی مسائل میں وقت ضائع کرنے کے بجائے تازہ فکری اور ادبی رجحانات کے بارے میں اپنے مثبت خیال کا اظہار کریں، جس کے لئے "بساط ادب" کے اوراق حاضر ہیں۔ اظہار خیال میں حروف کی حرمت اور عظمت کا بھی خیال رکھا جائے۔

ادب میں شخصیات اور نظریات کے حوالے سے اختلاف رائے کا ہونا بعید از قیاس نہیں۔ صحت مند معاشرے کی تشکیل اور ادب کی تعمیر میں اختلاف رائے کا ہونا ضروری نہیں، لازمی ہے لیکن اختلاف نظر کا مقصد یہ نہیں کہ معیار نظر بھی نچلی سطح پر آجائے۔ اس سے صحت مند خیالات راہ نہیں پاسکتے۔ تخلیق کار کے لئے تخلیق کا جو مقصد ہو صرف اسے پیش نظر رکھنا چاہئے۔ معاشرے میں موجود برائیوں کی نشاندہی اور اس کے سدباب کے امکانی پہلو پر روشنی ڈالنا شاعر اور ادیب کا ہی کام ہے لیکن یہ کام ادب کے دامن کو تھام کر ہی کرنا ممکن ہے۔ (مدیر)

خودنوشت اور غیر بنگالی

(مطبوعہ۔ پندرہ روزہ "بساط ادب" یکم جولائی 1998ء)

ماہنامہ "افکار" کے مئی کے شمارے میں حمایت علی شاعر کی منظوم خودنوشت کی 34 ویں قسط پڑھ کر ازحد افسوس ہوا۔ وہ لکھتے ہیں۔

وہاں پہ جو بھی تھے آباد "غیر بنگالی"
تھے ڈھول کی طرح ان کے بھی اندروں خالی
یہ ڈھول بجتے تھے باہر کی ضرب سے اکثر
وہ بے خبر رہے اندر کے کرب سے اکثر
ہر ایک چیخ کی بابت خیال تھا ان کا
وہ آدمی نہ تھا "چابی بھرا کھلونا" تھا
ہر اک کھلونے کی چابی تھی انڈیا میں کہیں
بنا تھی ساری خرابی کی انڈیا میں کہیں
سو انڈیا نے کیا وہ جو اس کی "خواہش" تھی
وہاں ہمارا وطن توڑنے کی سازش تھی
بالاخر اس نے چلی چال ایک ایسی بھی
کہ سانپ بھی مرے، ٹوٹے نہ اس کی لاٹھی بھی

مدہوشی نے مرحوم مشرقی پاکستان میں "غیر بنگالی" (جن کا تعلق نہ صرف ہندوستان کے تمام علاقوں بلکہ موجودہ پاکستان کے چاروں صوبوں کی تمام قومیتوں اور زبانوں کے بولنے والوں سے تھا) کو ایسے کھلونے سے تعبیر کیا، جس کی چابی انڈیا میں تھی حالانکہ ان تمام لوگوں کی حب الوطنی کسی بھی شک و شبہ سے نہ صرف یہ کہ بالاتر تھی بلکہ ہے اور انشاء اللہ رہے گی۔

شاعر کو یقیناً" کوئی بڑی آشیرواد حاصل ہے اور باقی ماندہ پاکستان سے دشمنی نبھانے کے لئے منافرت اور تعصب کا زہر قوم کی رگوں میں اتارنے کی کوششوں کے عوض بھاری نذرانے یا تو وصول کئے ہیں یا عمر کے اس حصے میں اپنی آہنی حالت پر اختیار نہیں یا پھر فطری وطن دشمنی کے جذبے سے سرشار ہو کر نہ صرف تاریخ کا چہرہ مسخ کرنے کے درپے ہیں بلکہ

بے یقینی کی صورتحال پیدا کر کے اپنے آقاؤں کی خواہش کے مطابق نئی تاریخ ترتیب دینے کی کوشش میں مصروف۔

انہیں اپنی اس تحریر کے حوالے سے پوری پاکستانی قوم سے معافی مانگنی چاہئے کہ جنہوں نے سابق مشرقی پاکستان کی بقا کی جنگ لڑی اور شہادت پائی' جنگی قیدی بنائے گئے۔ پاکستانی افواج اور عوام جنہوں نے عزت' آبرو مال و دولت سب کچھ سانحہ مشرقی پاکستان کے حوالے سے نچھاور کر دیا اور بنگلہ دیش کے کیمپوں میں 27 سال سے پاکستان کا نام زندہ رکھنے والے مجبور' بے بس اور وطن پرست عوام اور ان کے لواحقین سے بھی کیونکہ پاکستانی قوم ان کی اس بے لگامی اور خرافات کو ہرگز ہرگز قبول نہیں کرے گی اور ساتھ ہی ساتھ انہیں اپنی "مذموم خودنوشت" کی اشاعت ترک کر دینی چاہئے۔

ہم آپ کے موقر جریدے کی معرفت اپنا احتجاج قلمبند کرتے ہوئے شاعر کی "مذموم خودنوشت" کو مسترد کرتے ہوئے مذمت کرتے ہیں اور تمام سیاسی' سماجی اور ادبی تنظیموں سے بھی یہی توقع کرتے ہیں۔

(ابن عظیم فاطمی)

اس خط کے جواب میں حمایت صاحب نے کہا تھا:

"یہی اشعار ایک بار پھر پڑھیں اور سوچیں کہ "چیخ" کس کی ہے اور "خیال" کس کا ہے۔ ارے بھائی "چیخنا" وہی ہے جس پر ظلم ہوا ہو' جس کا حق تلف ہوا ہو..... اور "مظلوم" بنگالی تھے نہ کہ "غیر بنگالی" وہ اپنے وطن میں رہ کے "غریب الوطن" تھے۔ ان کی زبان' ان کی تہذیب' ان کی تاریخ' سبھی اپنے حقوق کو ترس رہی تھی۔ حالانکہ پاکستان بلکہ سارے ہندوستان میں سب سے بڑی تعداد "بنگالی مسلمانوں" کی تھی۔ پاکستان کی تحریک میں بھی وہی پیش پیش تھے اور ان کے بعد وہ لوگ جنہیں اب "مہاجرین" کہا جاتا ہے' جو "مہاجر" نہیں بلکہ "تارکینِ وطن" تھے۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہیں لکھا ہے کہ "ہجر" میں "وصل" کی آرزو پوشیدہ ہوتی ہے (فتح مکہ اس کی دلیل ہے) خیر یہ ایک طویل بحث ہے۔ تاریخی حقیقت تو یہ ہے کہ علامہ اقبال کا خطبہ الہ آباد (۱۹۳۰ء) جس کی بناء پر "تصورِ پاکستان" ان سے منسوب ہے' اس میں مغرب کے صرف چار صوبوں یعنی پنجاب' سندھ' بلوچستان اور سرحد کا ذکر ہے۔ مشرق کے "بنگالی مسلمانوں" کا نام تک نہ رہا پھر یعنی پاکستان بننے کے بعد (اقتدار اپنے ہاتھ میں رکھنے کی خاطر) "ون یونٹ" بنا دیا گیا

باقی صفحہ ۴۶ پر

تضمین (آئینہ در آئینہ)

(مطبوعہ۔ "بساط ادب" کراچی یکم جولائی 1998ء)

مری ہے ① معذرت یہ صاحب کلام کے ساتھ
نہیں ہے دل لگی اچھی کبھی عوام کے ساتھ
غلط بیانی صحافی کو زیب دیتی نہیں
کبھی بھی ہسٹری سچ کو فریب دیتی نہیں
ادب کا کام ہے کہ راستی دکھائے وہ
زبان خلق سے صفحات کو سجائے وہ
اگر اسی طرح کرلیں وہ نظم میں ترمیم
ہر اک نظر میں ہوں شاید وہ قابل تعظیم
سقوط مشرقی قصہ کوئی فسانہ نہیں
وہ اک المیہ ہے قصہ وہ مطربانہ نہیں
وہ ایک بازو تھا ملک عزیز کا سنئے
مگر وہ بازو کہ افسوس کٹ گیا سنئے
زباں تھی اردو، ہوئے آکے جو وہاں آباد
کہ جن کا نعرہ تھا اے ارض پاک زندہ باد
چنا بنا تھا جو لوہے کا انڈیا کے لئے
یہی وہ طبقہ تھا قرباں ہوا وفا کے لئے
وہاں کے باسی، تھی جن کی زبان بنگالی
تھے ڈھول کی طرح ان کے بھی اندروں خالی
یہ ڈھول بجتے تھے باہر کی ضرب سے اکثر
مگر وہ چیختے اندر کے کرب سے اکثر
ہر ایک چیخ کی بابت خیال تھا سب کا
وہ آدمی نہ تھا چابی بھرا کھلونا تھا

مدیر ''جسارت'' کے نام

(مطبوعہ روزنامہ ''جسارت'' کراچی 9/اگست 1998ء)

عزیز اجمل سراج صاحب!

سلام مسنون

میں بہاولپور گیا ہوا تھا۔ ایک کل پاکستان مشاعرے میں۔ بہت سے شعراء سے ملاقاتیں ہوئیں اور ایک ایسے صاحب سے بھی جو روزنامہ ''جسارت'' سے تعلق رکھتے ہیں۔ انہوں نے مجھے 12 جولائی کا اخبار دکھایا، جس میں ''ادبی صفحہ'' ہوتا ہے، اس صفحے کے انچارج آپ ہیں۔ اور اسی صفحے پر وہ مراسلہ بھی چھپا ہے جو پہلے بھی مختلف رسالوں میں دوبار چھپ چکا ہے۔

یہ مراسلہ اب سے دو ماہ قبل 16 مئی 1998ء کو ایک نام نہاد پندرہ روز ''ادب'' اخبار میں شائع ہوا تھا۔ پھر 16 جولائی 1998ء کو ہفت روزہ ''تکبیر'' میں چھپا لیکن مدیر محترم نے کچھ قطع و برید کرکے اسے مراسلوں کے کالم میں چھاپ دیا تھا۔ اب آپ نے باضابطہ ''ادبی صفحہ'' پر تصدیق کئے بغیر اسے ''فوری توجہ کا مسئلہ'' کے عنوان سے تیسری بار شائع کیا۔

مراسلہ نگار تو ادب کا آدمی معلوم نہیں ہوتا (اس کی تحریر خود اس کی بے ادبی اور لاعلمی کی گواہ ہے) ہاں اس کے پیچھے کوئی ''رقیب روسیاہ'' ضرور جھلکتا ہے، جس نے اسے اوٹ پٹانگ معلومات فراہم کیں اور دو ایک کٹیلے شعر سنا کر اس کے جذبۂ عصبیت کو ابھار دیا اور میرے خلاف کھڑا کر دیا لیکن بھائی اس بے بنیاد مراسلے کا تین بار چھپنا اور اس التزام کے ساتھ! مجھے بھی کچھ سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔

برادر عزیز! آپ ادب کے آدمی ہیں اور ماشاء اللہ اچھے نوجوان شعراء میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔ میں بھی آپ سے خوش گمان ہوں۔ کیا آپ کی ادبی اور صحافتی اخلاقیات اس بات کی اجازت دیتی ہے کہ بلا تحقیق کسی کے خلاف کچھ بھی چھاپ دیا جائے؟

میں آپ سے پوچھتا ہوں، کیا آپ نے میری منظوم سوانح حیات پڑھی ہے؟ اگر آپ نے پڑھی ہے اور آپ بھی مراسلہ نگار کے ہم خیال ہیں تو آپ کو بہت پہلے میرے خلاف قدم اٹھا لینا چاہئے تھا۔ یہ منظوم سوانح تو گذشتہ تین سال سے ماہنامہ ''افکار'' میں قسط وار چھپ رہی ہے اور اب تک اس کے دو ہزار سے زیادہ اشعار چھپ چکے ہیں مگر ایک مخصوص ''ذہن'' کے سوا کسی اہل ادب نے میرے اشعار میں کوئی ایسی بات نہیں دیکھی، جس کی طرف مراسلہ

نگار نے اشارہ کیا ہے۔ آپ نے اور ادارہ "جسارت" نے بھی شاید ایسا نہیں سوچا کیونکہ ابھی کچھ دن پہلے "جسارت" ہی کے ایک کل پاکستان مشاعرہ میں مدعو کرنے کے لئے آپ میرے گھر آئے تھے۔ آپ کے دعوت نامے میں میرا نام بھی موجود ہے (یہ الگ بات کہ میں ہی شریک نہ ہوسکا) کیسی عجیب بات ہے۔

جناب شیخ کا نقش قدم، یوں بھی ہے اور یوں بھی

میرے عزیز! مانا کہ آپ اخبار میں ملازم ہیں مگر آپ ان صحافیوں میں نہیں ہیں جو "زرد صحافت" کو ذریعہ شہرت بناتے ہیں۔ یہ لوگ جو دوسروں کی پگڑی اچھال کر کسی دن خود بھی عزت گنوا دیتے ہیں ایسے نہیں کہ انہیں جواب دیا جائے مگر کیا کروں "تکبیر" اور "جسارت" جیسے رسائل اور اخبار بھی ان کے آلہ کار بن جائیں تو دکھ ہوتا ہے۔ ان دونوں کی پیشانی پر قرآنی آیات لکھی ہوئی ہیں اور دونوں ایک مخصوص نظریہ حیات بھی رکھتے ہیں۔ نظریات میں "اختلاف" بھی ہوتا ہے مگر اس کی سطح بلند ہوتی ہے۔ "مراسلہ نگار" کی ذہنی سطح پر خدارا نہ آیئے۔ بحیثیت ایک "بزرگ دوست" یہ میری نصیحت بھی ہے اور وصیت بھی۔

اور اب میں ان لوگوں سے مخاطب ہوتا ہوں جو چھپ کر وار کر رہے ہیں۔ میں انہیں دعوت دیتا ہوں کہ سامنے آئیں اور میرے کلام اور میرے عمل کی روشنی میں ان رکیک الزامات کا محاسبہ کریں۔ میں واضح الفاظ میں کہتا ہوں کہ میں نے آج تک اپنی کسی نظم کو مسترد نہیں کیا، جن نظموں کے حوالے دیئے گئے ہیں، وہ میری کتابوں کے ہر ایڈیشن میں موجود ہیں۔ یہ کتابیں پاکستان میں بھی چھپی ہیں اور ہندوستان میں بھی۔ اور خدا کے فضل سے اپنے دور کی بہترین کتب کے طور پر انعام یافتہ بھی ہیں۔ "مٹی کا قرض" (مطبوعہ 1974ء) رائٹرز گلڈ کا آدم جی ادبی ایوارڈ یافتہ اور "ہارون کی آواز" پر 1985ء میں اکادمی ادبیات کے "ہجرہ ایوارڈز" کے سلسلے میں "علامہ ڈاکٹر محمد اقبال ایوارڈ" مل چکا ہے۔

جو حضرات میرے خلاف مراسلہ بازی کر رہے ہیں، وہ آج سے نہیں گذشتہ تیس چالیس سال سے اسی عذاب میں مبتلا ہیں۔ میں نے جو بھی کام کیا خواہ ریڈیو، فلم، ٹی وی، تدریس۔ شاعری میں مختصر ترین نظم "ثلاثی" ہو کہ طویل ترین نظم "آئینہ در آئینہ" _____ کسی مقام پر ان حضرات نے اپنے "ظرف" کا مظاہرہ نہیں کیا؟

افسوس ہے کہ آپ بھی انہیں اپنے صفحات میں جگہ دینے لگے۔ کیا میں امید کروں کہ آپ میرا خط بھی اپنے موقر اخبار میں شائع کردیں گے۔

حمایت علی شاعر

بے چہرگی

(مطبوعہ۔ روزنامہ "جسارت" کراچی 9/اگست 1998ء)

آئینہ در آئینہ بے چہرگی
کرب جاں ہے دیکھنا بے چہرگی
ڈھول کا جو پول ہے خود ہی میاں
وہ چھپائے گا سدا بے چہرگی
اندرونی کرب سے خالی ہے جو
کس کو دکھلائے بھلا بے چہرگی
ڈھول کی آواز پر جب رقص ہو
رنگ دکھلائے گی کیا بے چہرگی
قدر و قیمت ایک سی کیا ہوا امان
چہرہ رکھنا اور کجا بے چہرگی

(یاور امان)

اس غزل کے جواب میں حمایت صاحب نے مسکرا کر فارسی کا ایک مشہور مصرعہ پڑھ دیا
جواب جاہلاں باشد خموشی

بقیہ صفحہ ۴۷

تک ہم "خود انتقادی" سے گریز کریں گے، ہمیں اپنی کج فہمیوں اور غلط کاریوں کا اندازہ نہیں ہوگا اور ملک اور قوم کی تباہی میں ہم بھی برابر کے شریک سمجھے جائیں گے۔ آپ کا بھی چونکہ یہی نقطہ نظر ہے اس لئے ممکن ہے آپ مجھ سے اتفاق کریں۔ امید ہے کہ آپ میرا یہ خط شائع کر کے مجھے ممنون فرمائیں گے۔

والسلام

آپ کا مخلص

حمایت علی شاعر

ایک بیان

(مطبوعہ "جنگ آمد" لاہور 16/اگست 1998ء)

انہیں صاحب کا بیان مختصر طور پر پندرہ روزہ "لٹریری نیوز" لاہور یکم ستمبر 1998ء میں بھی چھپوایا گیا ہے۔ نظم "مارچ پاسٹ 1971ء" جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے کہ آج سے 27 سال پہلے چھپی تھی اور حمایت صاحب کے مجموعہ ء کلام "مٹی کا قرض" (مطبوعہ 1974ء) میں بھی موجود ہے۔ اس کتاب کو 1974ء کا "رائٹرز گلڈ آدم جی ادبی ایوارڈ" بھی مل چکا ہے۔ مذکورہ نظم "چراغ بکف" میں بھی شائع کی جارہی ہے۔ پڑھئے اور فیصلہ کیجئے کہ اس نظم میں نظریہ پاکستان کی کہاں تنسیخ ہوئی ہے؟ مجھے یقین ہے کہ عبدالرزاق خان (سابق اسپیکر سندھ اسمبلی) نے اس نظم کو کبھی پڑھا ہی نہیں' صرف چند لوگوں کے ورغلانے پر حمایت صاحب کے خلاف بیان داغ دیا۔ (مرتب)

سندھ اسمبلی کے سابق اسپیکر اور نیشنل ری پیٹری ایشن اینڈ ری ہیبلی ٹیشن کمیٹی کے بانی صدر عبدالرزاق خان ایڈوکیٹ نے اپنے ایک بیان میں حمایت علی شاعر کی نظم "مارچ پاسٹ 1971ء" کی مذمت کرتے ہوئے کہا ہے کہ شاعر نے جان بوجھ کر نظریہ پاکستان اور تاریخ پاکستان کو مسخ کرنے کی کوشش کی ہے۔ پاکستان کی مسلح افواج نے مشرقی پاکستان میں علیحدگی پسندوں اور ہندوستانی جارحیت کے خلاف دفاع پاکستان کا کردار ادا کیا تھا۔ اسی طرح وہاں کے غیر بنگالی بھی محب وطن پاکستانی تھے اور انہوں نے اپنے وطن عزیز کے لئے قربانیاں دی تھیں اور صرف غیر بنگالی ہی نہیں بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ بنگالیوں کی ایک بڑی تعداد بھی پاکستان کی حامی تھی' جس پر عوامی لیگ کے علیحدگی پسندوں نے طرح طرح کے ظلم ڈھائے۔ گذشتہ دنوں کراچی کے ایک ادبی ماہنامہ میں شائع ہونے والی حمایت علی شاعر کی نظم کے حوالے سے عبدالرزاق خان نے مزید کہا کہ افواج پاکستان اور پاکستان پرستوں کا مذاق اڑانا محب وطن شہریوں کو غدار اور غدار کو مظلوم قرار دینے کے عمل کو شاعر کی کج فکری ہی کہا جاسکتا ہے دانشمندی نہیں' بالخصوص ایسے وقت میں جبکہ وطن عزیز نازک دور سے گزر رہا ہے۔ ایسی باتوں سے اجتناب لازمی ہے۔

(عبدالرزاق۔ ایڈوکیٹ)

اس مراسلے پر تو شاید حمایت صاحب بھی یہی کہیں گے کہ

فکر ہر کس بقدر "دانش" اوست

(تصرف کے ساتھ)

ایک خط

محترم ایڈیٹر صاحب ''بساطِ ادب'' (کراچی)

محترمی۔ آداب

عرض یہ ہے کہ آپ نے اپنے پرچے ''بساطِ ادب'' کی بساط جس مہم جوئی پر جمائی ہوئی تھی اب اس پس منظر سب پر بخوبی واضح ہو چکا ہے۔ بالخصوص ایک ''مخصوص شاعر'' کے ان اشعار کی روشنی میں جو آپ میرے اور دوسرے افراد کے جوابی خطوط کے ساتھ شائع فرماتے رہے ہیں۔ یہ سراغ بھی مل جاتا ہے کہ

کون ''فرزیں'' ہے کسی ''شہ'' کو بچانے والا
کون شطرنج کا ہے یہ کھیل رچانے والا

مزید یہ کہ آپ کا نقطہ نظر بھی واضح ہو جاتا ہے کہ آپ ایسا کوئی خط شائع کرنے کے حق میں نہیں جو تصویر کا دوسرا رخ پیش کرتا ہو۔ مثلاً ڈاکٹر محسن کا وضاحتی خط (جس کی فوٹو کاپی میرے پاس بھی ہے اور میرے وکیل کے پاس بھی) خیر۔ اس مسئلے پر مجھے آپ سے کچھ نہیں کہنا۔ لیکن اب ''بساطِ ادب'' میں ایک نئی سلسلہ وار کہانی محترم حمایت علی شاعر کے خلاف ''مراسلہ بازی'' کے روپ میں شروع کی گئی ہے اور اس کی کئی قسطیں ''ریڈرشپ میں اضافے'' کی خواہش کے پیشِ نظر منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔ ''اس سادگی پر کون نہ مر جائے اے خدا۔'' لیکن اس سے ایک بات بہت واضح ہو جاتی ہے کہ آپ اور ''آپ کے ساتھی'' محترم حمایت علی شاعر جو ملک اور بیرونِ ملک بھی ایک نامور شاعر کی حیثیت سے جانے اور پہچانے جاتے ہیں، کے خلاف نیت باندھ کے صف آراء ہو گئے ہیں۔ جناب حمایت علی شاعر کی منظوم سوانح حیات گذشتہ تین سال سے ماہنامہ ''افکار'' میں ''آئینہ در آئینہ'' کے عنوان سے ہر ماہ قسط وار شائع ہو رہی ہے اور اب تک دو ہزار سے زائد اشعار شائع ہو چکے ہیں اور یہ بات مجھ سے زیادہ بہتر تمام اہل ادب جانتے ہیں کہ ایسی خود نوشت سوانح حیات جس میں اپنی آپ بیتی اپنے عہد کے سیاسی تہذیبی اور سماجی مسائل کی روشنی میں ''منظوم'' رقم کی گئی ہو کم از کم اردو میں اب تک نہیں لکھی گئی۔ ایسی معرکتہ الآراء نظم کے درمیان سے چند اشعار نکال کر اور ان کو اپنے وضع کئے ہوئے معنی و مفہوم کی روشنی میں دیکھ کر جناب حمایت علی شاعر کو وطن دشمن اور ہندوستان کا ایجنٹ قرار دینا نہایت ہی شرمناک جھوٹ اور ذاتی عداوت کے مترادف ہے۔ جو ''شاعر و ادیب'' اس مہم کے پس پردہ کام کر رہے ہیں وہ گذشتہ تیس پینتیس برس سے حملہ تصاحب پر کیچڑ اچھالنے میں مصروف ہیں۔ مگر وہ ابھی تک ان کا دامن داغ دار نہ کر سکے۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گی کہ ''اللہ کی لاٹھی میں آواز نہیں ہوتی'' کے مصداق خود ہی اللہ کے عذاب سے دوچار ہیں۔ میں نے یہ بات پہلے بھی کہی تھی کہ اعمال کی سزا دنیا ہی میں مل جاتی ہے اور بدفطرت لوگوں کا انجام سامنے نظر آ جاتا ہے۔

خدا سب پر رحم فرمائے۔ میں آپ سے یہ کہنا چاہتی ہوں کہ حمایت صاحب کو سزا دلوانے سے پہلے آپ اور ''بساطِ ادب'' کے مشیرانِ کرام اس منظوم سوانح حیات کا بلا استعیاب مطالعہ کرلیں اور یہی نہیں بلکہ ان کی تمام کتابوں کو دوبارہ پڑھیں کیونکہ کراچی کے بڑھتے ہوئے پلیوشن کے باعث ہوسکتا ہے کہ آپ کی یادداشت کچھ متاثر ہوگئی ہو۔ ''بساطِ ادب'' کے پچھلے اور تازہ شمارے (مورخہ 16 مئی تا 31 مئی) میں جن حضرات کے مراسلے حمایت صاحب کے خلاف شائع کیے گئے ان میں لکھا گیا ہے کہ حمایت صاحب اپنی نظم ''مارچ پاسٹ 71ء'' اور 65ء کی جنگ کے دوران لکھی گئی مقبول ترین نظم ''لہو'' کو مسترد کرچکے ہیں اور یہ نظمیں ان کے کسی مجموعے میں شامل نہیں۔ کہتے ہیں کہ نقل نویس را عقل نہ باشد۔ جس ''مخصوص شاعر'' نے ان مراسلہ نگاروں کی رہنمائی کی ہے۔ ان کی اطلاع کے لئے عرض کردوں کہ یہ دونوں نظمیں حمایت صاحب کے مجموعہ کلام ''مٹی کا قرض'' مطبوعہ 1974ء میں موجود ہیں اور اس کتاب کے نہ صرف پاکستان بلکہ ہندوستان میں (اردو اور ہندی رسم الخط میں) اب تک چھ ایڈیشن شائع ہوچکے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ منظوم سوانح حیات کے ''اشاریئے'' میں ان نظموں کے ساتھ جگہ جگہ کتاب کا حوالہ بھی دیا گیا ہے مگر..... خیر چھوڑیئے..... ریکارڈ کی درستگی کے لئے یہ بھی عرض کردوں کہ اس کتاب پر جناب حمایت علی شاعر کو 1974ء میں پاکستان رائٹرز گلڈ کا مشہور آدم جی ادبی ایوارڈ بھی مل چکا ہے۔ مزید یہ کہ حمایت صاحب کی تمام کتابوں میں صرف اسی کتاب کی تقریب رونمائی تین شہروں میں منعقد ہوئی تھی۔ کراچی میں اس کی صدارت جناب اختر حسین رائے پوری لاہور میں جناب فیض احمد فیض اور سکھر میں جناب ڈاکٹر کریم الدین احمد نے کی تھی۔ ان تقریبات میں مشہور و معروف اہل قلم کے علاوہ ''بساطِ ادب'' کے مشیرانِ محترم (پروفیسر آفاق صدیقی و علی حیدر ملک صاحبان) نے بھی اپنے مضامین پڑھے تھے پروفیسر آفاق صدیقی کا مضمون ''من موہنا شاعر'' کے عنوان سے ''طلوعِ افکار'' جولائی 1995ء ''گوشہ حمایت علی شاعر اور مجلّہ ''شخصیت'' کے ''حمایت علی شاعر نمبر'' (جولائی 1996ء) میں اور علی حیدر ملک صاحب کا مضمون روزنامہ ''جسارت'' میں شائع ہوچکا ہے۔ ممکن ہے کہ اب آپ تمام حضرات کو یاد آ گیا ہوگا کہ ''مٹی کا قرض'' میں کیا کچھ ہے..... کاش مراسلہ نگار حضرات بھی لکھنے سے پہلے کچھ پڑھ لیتے۔ ایسی تحریریں پڑھ کر مجھے تو سید محمد جعفری مرحوم کا وہ شعر یاد آتا رہا جو انہوں نے اپنے دور کے ایک حکمراں کے حوالے سے لکھا تھا۔

کیا لکھایا ہے کیا پڑھایا ہے
قدرت اللہ شہاب کیا کہنا!

فی الحال اتنا ہی کافی ہے۔ یہ خط میں بذریعہ رجسٹری بھیج رہی ہوں تاکہ ریکارڈ پر رہے۔ امید ہے کہ آپ اسے ضرور شائع کریں گے کیونکہ یہ ادب کے معاملات ہیں ورنہ یہ بھی ''دروغ بر گردن راوی'' ہی رہ جائے گا۔

مخلص (رعنا اقبال)

منفی اثرات

شاہین

(کینیڈا)

(مطبوعہ روزنامہ "افکار" کراچی اگست 1998ء)

مئی کا "افکار" ملا۔ بالواسطہ ہی سہی آپ کی خیریت کا علم ہوا نظم "جل بجھتی ہے رات" چھاپنے کا شکریہ۔ ہمیشہ کی طرح تہہ دل سے ممنون ہوں۔ "افکار" اور صاحب افکار سے میرا علاقہ اتنا قدیم ہے کہ رسمی الفاظ اچھے نہیں لگتے۔

حمایت علی شاعر کی خودنوشت میں شاعری اور بیسویں صدی کی تاریخ کی آخری چھ دہائیوں کا دلچسپ امتزاج نظر آتا ہے لیکن مزرع زندگی ہری کرنے والی شاعری میں اگر کہیں کہیں کوئی فصل غارت کرتی دکھائی دے تو اسے نظرانداز کرنا آسان نہیں ہوتا۔ مرحوم مشرقی پاکستان میں مقیم غیر بنگالی آبادی سے متعلق ان کے خیالات وہی ہیں جو طوفان کا ساحل سے نظارہ کرنے والوں کے ہوتے ہیں۔

وہاں یہ جو بھی تھے آباد غیر بنگالی
تھے ڈھول کی طرح ان کے بھی اندروں خالی

یہ ڈھول بجتے تھے باہر کی ضرب سے اکثر
وہ بے خبر رہے اندر کے کرب سے اکثر

حقیقت تو یہ ہے کہ بیس بائیس برس کے قلیل عرصے میں جو ایک قوم کی زندگی کا محض نقطہء آغاز ہوتا ہے۔ اس غیر بنگالی آبادی نے مقامی لوگوں سے جو تعلق استوار کیا تھا' وہ اپنی مثال آپ تھا۔ مقامی اور غیر مقامی میں شادیاں ہو رہی تھیں۔ غیر بنگالی' بنگالی زبان میں اتنی مہارت حاصل کر رہے تھے کہ ان کے بچے بنگلہ میں اول آتے تھے۔ وہ بڑی حد تک اپنے ماں باپ کی زبانیں بھول چکے تھے۔ ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہوتے تھے۔ وہاں کے کھانے کھاتے تھے۔ کسی حد تک رہن سہن بھی اپنا چکے تھے۔ ہماری اردو کی نشستوں میں

کوئی جسیم الدین اور بیگم صوفیہ کمال جیسی شخصیتیں شریک ہوتی تھیں اور ہماری تخلیقات پر اظہار خیال کرتی تھیں۔ دفتروں میں دوستیاں بڑھ رہی تھیں۔ ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش میں تیز رفتاری آگئی تھی۔ حمایت علی شاعر باشعور شخص اور شاعر ہیں، کوئی اور اس طرح کی صحیح تجزیے کے بغیر، لاعلمی پر مبنی، منفی تاثرات کی حامل، غیر معتبر باتیں لکھتا تو اس طرف میں دھیان بھی نہیں دیتا۔ یہ وہ سانحہ ہے کہ لکھنے کو بہت کچھ جی چاہتا ہے۔ کم لکھے کو بہت جانئے۔ اس ضمن میں شاہد کامرانی کے افسانوی مجموعے "بے انت سفر" کے مطالعے سے حقیقت حال کسی حد تک واضح ہوگی۔

اردو کے منفرد اور ضخیم ادبی مجلہ

شخصیت

کا

حمایت علی شاعر نمبر

(دوسرا ایڈیشن)

نئی ترتیب اور اضافوں کے ساتھ

نگراں: شفیق الزماں

مرتب: انور جمیں قریشی

(زیرِ طبع)

A-1، منیر گارڈن، بلاک نمبر 18، گلستانِ جوہر، کراچی

جوابِ آں غزل

حمایت علی شاعر

(مطبوعہ۔ ماہنامہ "افکار" ستمبر 1998ء)

"افکار" کے تازہ شمارے میں اپنے دوست شاہین غازی پوری کا خط پڑھا۔ انہیں میری منظوم سوانح حیات کے "دو اشعار" سے شدید شکایت ہے۔

اتفاق سے یہی "دو اشعار" کراچی میں بھی کچھ ایسے شعراء کو جن کا آبائی تعلق ہندوستان کے صوبہ 'بہار سے ہے----- بہت گراں گزرے اور انہوں نے یہاں کے بعض معروف و غیر معروف' ادبی اور سیاسی رسائل و اخبارات میں میری مخالفت کا ایک سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔ صرف ان "دو اشعار" کی بناء پر ان حضرات نے مجھے پاکستان دشمن اور ہندوستان کا ایجنٹ ہی نہیں' اسلام اور امت مسلمہ کا مخالفت تک لکھ دیا اور میرے ڈانڈے مکتی باہنی سے لے کر سندھو دیش کے "پاکستان دشمنوں" تک سے ملا دیئے' یہی نہیں میرے خلاف غزلوں کے اشعار کے علاوہ چالیس پچاس اشعار کی نظمیں تک چھپوا دیں اور حکومت پاکستان کے مختلف محکموں سے اپیل کی کہ مجھ "دریدہ دہن شاعر" پر ریڈیو اور ٹی وی کے دروازے بند کر دیئے جائیں اور بیرون ملک مشاعروں وغیرہ میں بھی میری شرکت پر پابندی لگادی جائے۔

"ناطقہ سر بہ گریباں ہے' اسے کیا کہیئے؟"

دلچسپ بات یہ ہے کہ ایسے سنگین الزامات کے ثبوت میں میرا ایک شعر بھی نہیں دیا گیا اور جن نظموں کے حوالے دیئے' وہ سب میری "ایوارڈ یافتہ" کتابوں کے ہر ایڈیشن میں موجود ہیں۔ "مٹی کا قرض (مطبوعہ 1974ء - رائٹرز گلڈ کا آدم جی ادبی ایوارڈ) ہارون کی آواز (مطبوعہ 1985ء - اکادمی ادبیات کا علامہ ڈاکٹر محمد اقبال ایوارڈ) یہ مراسلے جب "تکبیر" اور "جسارت" جیسے رسائل و اخبارات (جماعت اسلامی کے ترجمان) میں بھی بغیر کسی تحقیق و تصدیق کے "خطرناک سرخیوں" کے ساتھ شائع کئے گئے تو میں نے ان کے مدیران کرام کو خطوط لکھے اور (1965ء تا 1972ء) کے واقعات سے متعلق اپنی سوانح حیات کی (تقریباً" دو سو اشعار پر مشتمل) تین اقساط برائے مطالعہ بھیج دیں کہ "تکبیر" کی مجلس مشاورت میں کراچی یونیورسٹی کے کچھ اساتذہ بھی شامل ہیں جو اتفاق سے میرے دوست ہیں کہ ممکن ہے انہوں

نے میری سوانح نہ پڑھی ہو مگر ان رسائل نے میرا ایک شعر بھی شائع نہیں کیا۔

اب شاہین کا خط چھپا ہے جو آٹوا (کینیڈا) میں رہتے ہیں۔ ادب کے باضابطہ پڑھنے والے جانتے ہیں کہ یہ سوانح حیات "آئینہ در آئینہ" کے زیر عنوان گذشتہ تین سال سے ماہنامہ "افکار" میں قسط وار چھپ رہی ہے اور اس کے اب تک دو ہزار سے زیادہ اشعار چھپ چکے ہیں۔ میں سوچتا ہوں کہ یہ "مخصوص ذہنیت" کے لوگ صرف "دو اشعار" کی بناء پر جب میرے ساتھ یہ "ہولناک سلوک" کرسکتے ہیں تو اپنے "بنگالی بھائیوں کے ساتھ کیا کچھ نہ کیا ہوگا۔ شاہین نے جو مثالیں دی ہیں' وہ باشعور لوگوں کی ہیں۔ اچھے لوگ ہر جگہ ہوتے ہیں وہاں یقیناً" ایسے "غیر بنگالی" بھی تھے جو ان کے دکھ درد میں دل سے شریک تھے مگر بات "مجموعی طرز عمل" کی ہے۔ تاریخ مجموعی عمل کی گواہی دیتی ہے۔ میں نے اپنے اشعار میں "غیر بنگالیوں" کے اسی کردار و عمل کی طرف اشارہ کیا ہے۔

یہاں پہ جو بھی تھے آباد "غیر بنگالی"
تھے ڈھول کی طرح ان کے بھی اندروں خالی

یہ ڈھول بجتے تھے' باہر کی ضرب اکثر
وہ بے خبر رہے' اندر کے کرب سے اکثر

ظاہر ہے کہ "غیر بنگالی" سے مراد وہ سب لوگ ہیں جو ہندوستان کے مختلف علاقوں سے جاکر وہاں آباد ہوئے اور وہ بھی جو "مغربی پاکستان" سے وہاں گئے اور جنہوں نے اس سرزمین سے رشتہ نہیں جوڑا۔ رہی "بنگالی زبان" سیکھنے کی بات تو وہ اس لئے ضروری تھی کہ 1954ء ہی میں (ون یونٹ کے قیام سے پہلے) عوامی مطالبے سے مجبور ہوکر مسلم لیگ نے اردو کے ساتھ بنگالی کو بھی "قومی زبان" قرار دے دیا تھا۔ وہاں کی تعلیمی اور سرکاری زبان بنگالی اور انگریزی تھی مگر یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ میرے اشعار کو کچھ لوگوں نے اپنے "قبیلے" سے متعلق کیوں سمجھ لیا۔ کاش انہیں اردو کے ایک "نادان" بزرگ ادیب کا یہ فقرہ بھی یاد ہوتا کہ جو زبانیں دائیں سے بائیں لکھی جاتی ہیں' وہ اسلامی ہیں اور جو بائیں سے دائیں لکھی جاتی ہیں' غیر اسلامی ہیں (اس فقرے پر بنگالیوں نے احتجاج بھی کیا تھا)

جہاں تک بنگالیوں کی "حق تلفی" کی بات ہے تو اس کی گواہ پوری تاریخ ہے۔ مزید برآں جنرل یحییٰ خاں کی حکومت اور ان کے سیاسی اقدامات کے بارے میں سپریم کورٹ کا فیصلہ بھی

موجود ہے (20/اپریل 1972ء)

بدگمانیاں اور نفرتیں بے سبب پیدا نہیں ہوتیں۔ ہمیں دوسروں پر الزام رکھنے سے پہلے اپنا چہرہ بھی آئینے میں دیکھ لینا چاہئے۔ میں نے اپنی سوانح حیات کا عنوان "آئینہ در آئینہ" اس لئے رکھا ہے کہ اس آئینے میں ہم سب کا چہرہ نظر آئے ——— ہر پاکستانی کا۔ ہماری طرز فکر اور ہمارے اعمال کے نتائج میں وہاں "بنگلہ دیش" بن گیا اور یہاں بھی "خطرات" منڈلا رہے ہیں۔ اس کے ذمے دار ہم سب ہیں۔ یا تو ہم نے "تحریک پاکستان" کو سمجھا نہیں تھا یا ہواؤں میں "غبارے" اڑا رہے تھے۔ ہمیں ہر مسئلہ کو تاریخی حقیقتوں کی روشنی میں سمجھنا اور پرکھنا چاہئے۔ جب ہم انفرادی طور پر "شہری نسبتیں" اپنے ناموں کے ساتھ محفوظ رکھ سکتے ہیں (لکھنوی، دہلوی، جالندھری، بھوپالی وغیرہ) تو وہ "اجتماعی تہذیبیں" جن کی جڑیں تاریخ میں پیوست ہیں۔ کیسے نظرانداز کی جاسکتی ہیں، اس میں انہیں قبول کرنا پڑے گا اور انہیں اپنا کر ملک اور قوم کی راہیں متعین کرنا پڑیں گی (اردو کی مقبولیت کا راز بھی اسی "دو طرفہ اپنائیت" میں پوشیدہ ہے)

میں نے کوشش کی ہے کہ ہر مسئلے کی بنیاد پر نظر رکھوں۔ مشرقی پاکستان کے بارے میں بھی میرا تجزیہ غیر جانب دارانہ ہے۔ میرے تمام اشعار کو اپنے سیاق و سباق کے ساتھ پڑھیں۔ حاشیوں میں، میں نے تاریخی حوالے بھی دے دیئے ہیں۔

جہاں تک ان "دو مخصوص اشعار" کا تعلق ہے، مجھے حیرت ہے کہ انہیں بھی اپنے پس منظر سے الگ رکھ کر پڑھا جارہا ہے اور غلط فہمیاں پھیلائی جارہی ہیں۔ افسوس ہے کہ صبا اکرام جیسے شاعر بھی "جوش جذبات" میں بہہ گئے۔ انہوں نے انگریزی اخبار "لیڈر" (کراچی) میں اور ڈاکٹر ایم آر کاظمی نے انگریزی روزنامہ "مسلم" (اسلام آباد) میں جو کچھ لکھا ——— وہ میری منظوم سوانح حیات سے عدم واقفیت کی دلیل ہے۔ اتفاق سے یہ تحریریں ابھی ابھی میری نظر سے گزریں جو بالترتیب 30 مئی اور 15 جون کو مذکورہ اخبارات میں شائع ہوئی تھیں اور کراچی میں میرے مخالفین کے "آلہ کار" ایک نام نہاد "ادبی اخبار" میں حال ہی میں چھپی ہیں۔

میں پوری قسط تو نقل نہیں کرسکتا، البتہ اپنے "غیر جانب دار اور باضمیر" قارئین کے لئے متعلقہ اشعار لکھتے ہوئے ان کی تشریح کئے دیتا ہوں۔

یہاں پہ جو بھی تھے آباد "غیر بنگالی"

تھے ڈھول کی طرح ان کے بھی اندروں خالی

یہ ڈھول بجتے تھے باہر کی ضرب سے اکثر
وہ بے خبر رہے اندر کے کرب سے اکثر

ہر ایک "چیخ" کی بابت خیال تھے ان کا
وہ آدمی نہ تھے "چابی بھرا کھلونا" تھے

ہر اک کھلونے کی چابی تھی انڈیا میں کہیں
بنا تھی ساری خرابی کی انڈیا میں کہیں

سو انڈیا نے کیا وہ، جو اس کی خواہش تھی
وہاں ہمارا وطن توڑنے کی سازش تھی

بالاخر اس نے چلی چال، ایک ایسی بھی
کہ سانپ بھی مرے، ٹوٹے نہ اس کی لاٹھی بھی

اس میں پہلا شعر توجہ طلب ہے "باہر کی ضرب" سے مراد "مشرقی پاکستان" سے باہر ـــــ یعنی مغربی پاکستان کے سیاست کاروں کا طرز عمل ـــــ جسے "غیر بنگالیوں" کی عموماً" حمایت حاصل تھی۔ وہ اکثر "بنگالیوں کے کرب" سے واقف نہیں تھے۔ ان کے مسائل میں شریک نہیں تھے چنانچہ "بنگالیوں کی چیخ" کی بابت ان کا خیال تھا کہ "وہ آدمی نہ تھے، چابی بھرا کھلونا تھے"۔ وہ بنگالیوں کے ہر احتجاج کو ہندوستان سے منسوب کردیتے تھے۔ (ہوسکتا ہے کہ اس "گمان" میں کچھ صداقت بھی ہو کیونکہ اگر اندر خلفشار ہو، بدگمانی ہو، زیادتی ہو ـــــ تو دشمن فائدہ اٹھاتا ہے) مگر ان لوگوں کو "غدار" کہنا جو تحریک پاکستان میں پیش پیش رہے ہوں، کہاں تک درست ہے (جبکہ ہماری حکومت کو بھی "سپریم کورٹ" نے غیر قانونی قرار دے دیا) ہندوستان نے یقیناً" ہماری نادانی، باہمی پھوٹ اور غیر دانشمندانہ حکمت عملی سے فائدہ اٹھایا ـــــ اور یہی میں نے لکھا ہے۔ اگر پچاس برس بعد بھی "سچ" نہ لکھا جائے تو ہم اپنی آئندہ نسلوں کو کب اپنی غلطیوں سے آگاہ کریں گے۔ انہیں مسائل پر لکھتے ہوئے میں نے سندھ کے پس منظر کی روشنی میں یہ بھی لکھا ہے کہ۔

اگر ہمیں فن تاریخ کا شعور نہیں
ہمارا اپنا بھی انجام ہم سے دور نہیں

نکہت بریلوی

ایک خط (بجنگ آمد)

(مطبوعہ پندرہ روزہ "بجنگ آمد" لاہور)

بھائی اختر شمار صاحب!

السلام علیکم

آپ کے اخبار کے 16/ اگست 1998ء کے شمارے میں حمایت علی شاعر کی ایک نظم "مارچ پاسٹ" (مطبوعہ 1971ء) کے بارے میں (جو ان کی زیر تحریر منظوم سوانح حیات میں بھی شامل ہے) ایڈوکیٹ عبدالرزاق خاں سابق اسپیکر سندھ اسمبلی (ایم کیو ایم کے رکن) کا بیان شائع ہوا ہے۔ موصوف نے 27 سال بعد اس نظم پر جو الزامات عائد کئے ہیں (شاید موصوف نے نظم پڑھی ہی نہیں ہے) وہ یوں درست نہیں کہ مذکورہ نظم حمایت علی شاعر کے مجموعہ ء کلام "مٹی کا قرض" (مطبوعہ 1974ء) میں موجود ہے اور اس کتاب پر انہیں رائٹرز گلڈ کا "آدمی جی ادبی ایوارڈ" بھی مل چکا ہے۔ دوسری بات یہ کہ ہماری جن کوتاہیوں کے سبب "بنگالہ دیش" بنا ممکن ہے وہ بحث طلب ہوں مگر سپریم کورٹ آف پاکستان نے 20/ اپریل 1972ء کو جس بناء پر جنرل یحییٰ خاں کی حکومت اور ان کے سیاسی اقدامات کو غیر قانونی قرار دیا' کیا اسے بھی غلط قرار دیا جاسکتا ہے؟ ایڈوکیٹ عبدالرزاق خاں صاحب یقیناً" اس تاریخی فیصلے سے واقف ہوں گے۔ تاریخ جب بھی لکھی جائے گی تجزیہ بھی ہوگا۔ حمایت صاحب بھی اپنی سوانح حیات اسی تاریخ کی روشنی میں لکھ رہے ہیں۔ ان کا اشارہ کسی "مخصوص علاقے" کے لوگوں کی طرف نہیں ہے بلکہ ان تمام لوگوں کے "مجموعی رویے" کی طرف ہے جو ہندوستان کے مختلف علاقوں سے جاکر مشرقی پاکستان آباد ہوئے تھے' اس لئے چند مخصوص اور غیر معروف لکھنے والوں کا چراغ پا ہونا ایک خاص "ادبی سیاست" کی نشاندہی کرتا ہے' اس کا ثبوت وہ مراسلہ بھی ہے جو "بجنگ آمد" کے تازہ شمارے (یکم تا 5 ستمبر 1998ء) میں شائع ہوا ہے۔ یہ مراسلہ پہلے بھی تین بار چھپ چکا ہے۔ سب سے پہلے کراچی کے ایک نام نہاد پندرہ روزہ "ادبی اخبار" میں 16 مئی کو چھپا' پھر روزنامہ "جسارت" کے ادبی صفحے میں 12 جولائی کو' اس کے بعد ہفتہ وار "تکبیر" میں 16 جولائی کو۔۔۔۔۔ اب آپ نے اپنے رسالے کی زینت بنا دیا ہے۔ (ظاہر ہے کہ آپ کو کراچی کی ادبی سیاست کا علم کہاں ہو سکتا ہے)

اس مراسلے کی بار بار اشاعت سے گمان ہوتا ہے کہ ہمارے ملک میں اس "مراسلہ نگار"

کے علاوہ کوئی پاکستان کا دوست نہیں، سبھی ہندوستان کے ایجنٹ ہیں۔ سبھی اسلام اور مسلمانوں کے دشمن ہیں کیونکہ آج تک کسی "پاکستانی" نے حمایت صاحب پر ایسے الزامات عائد نہیں کئے۔ یہ منظوم خودنوشت سوانح حیات "آئینہ در آئینہ" کے زیر عنوان گذشتہ تین سال یعنی اگست 1995ء سے ماہنامہ "افکار" میں قسط وار چھپ رہی ہے اور اب تک اس کے تقریباً "ڈھائی ہزار اشعار چھپ چکے ہیں۔

اگر حمایت صاحب نظریہ پاکستان کے مخالفت ہوتے تو پہلے یہ بات کسی نہ کسی کی نظر میں آجاتی۔ ہمارے اہل ادب اتنے بھی بے خبر نہیں۔ اس سارے ہنگامے کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ مئی 1998ء کے شمارے میں "بنگلہ دیش" کا المیہ رقم کرتے ہوئے حمایت صاحب نے مشرقی پاکستان کے غیر بنگالیوں کے عمومی رویے کے بارے میں دو شعر بھی لکھ دیئے تھے۔

وہاں پہ جو بھی تھے آباد "غیر بنگالی"
تھے ڈھول کی طرح ان کے بھی اندروں خالی
یہ ڈھول بجتے تھے باہر کی ضرب سے اکثر
وہ بے خبر رہے اندر کے کرب سے اکثر

ان دو اشعار پر چند حضرات جن کا آبائی تعلق ہندوستان کے صوبہ "بہار" سے ہے، اتنے خفا ہوئے کہ ہر طرف مراسلہ بازی شروع کردی۔ پچاس پچاس اشعار کی نظمیں اور غزلیں ان کے خلاف چھپوائیں اور ان پر ایسے ایسے سنگین الزامات عائد کردیئے کہ "عدالت" ہی اس کا فیصلہ کرسکتی ہے۔ حمایت صاحب نے بہت ضبط سے کام لیا اور صرف "تکبیر" اور "جسارت" کی عوامی اہمیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان کے مدیران کرام کو متعلقہ موضوع سے متعلق اپنی سوانح حیات کی مخصوص اقساط (35, 34, 33) کی فوٹو کاپیاں (تقریباً" دو سو اشعار) اپنے وضاحتی خطوط کے ساتھ ارسال کردیئے تاکہ غلط فہمی دور ہوجائے۔ (یہ خطوط 30 جولائی کو "تکبیر" میں اور 9/ اگست کو جسارت میں چھپ بھی گئے۔ یہ اور بات کہ انہوں نے حمایت صاحب کے اشعار یا ان کا انتخاب بھی شائع نہیں کیا)

آپ ادب کے آدمی ہیں اور معروف شاعر بھی ہیں۔ آپ کا اخبار بھی ادبی حلقوں میں توجہ سے پڑھا جاتا ہے۔ اس لئے مذکورہ مراسلہ اور اس کے جوابات کے تراشے اور تازہ "افکار" جس میں حمایت صاحب کا لکھا ہوا شاہین غازی پوری کے خط کا تفصیلی جواب بھی ہے، آپ کو بھیج رہا ہوں۔ حمایت صاحب اتفاق سے آجکل ملک سے باہر گئے ہوئے ہیں، میں

انہیں کی خواہش پر (ان کے جوابات کی روشنی میں) یہ وضاحت کر رہا ہوں کہ

انہوں نے آج تک اپنی کسی نظم کو مسترد نہیں کیا۔ جن نظموں کے حوالے دیئے جارہے ہیں' وہ سب ان کے مجموعۂ کلام "مٹی کا قرض" کے ہر ہر ایڈیشن میں موجود ہیں "لہو" بھی جو 1965ء میں لکھی گئی اور "مارچ پاسٹ" 1971ء بھی (جو عنوان سے ظاہر ہے کہ اسی زمانے میں لکھی گئی تھی)

معترضین نے نہ حمایت علی شاعر کی کوئی کتاب پڑھی اور نہ زیر تحریر منظوم سوانح حیات۔ انہوں نے حمایت صاحب کا کوئی ایسا شعر بھی پیش نہیں کیا کہ ان الزامات کو درست ثابت کرسکتے۔ آپ ہی سوچئے کہ ان مراسلوں کا کیا مقصد ہو سکتا ہے.....؟ صرف حمایت صاحب کو دکھ پہنچانا اور بدنام کرنا۔ اور یہ کوئی نئی بات نہیں۔ حمایت صاحب کے چند مخالفین برسوں سے یہ شغل اختیار کئے ہوئے ہیں۔ (حمایت صاحب کی خواہش کے مطابق) ایک کتاب "احوال واقعی" بھی آپ کو بھیج رہا ہوں جو 1994ء میں حیدر آباد سندھ سے شائع ہوئی تھی۔ دوسری کتاب "چراغ بکف" جلد ہی بھیجوں گا جو زیر طبع ہے۔ یہ کتابیں حیدر آباد سندھ اور کراچی کی ادبی سیاستوں کے بارے میں تاریخی مواد فراہم کرتی ہیں ------ آپ بھی پڑھیں اور سوچیں کہ۔

اس حادثۂ وقت کو کیا نام دیا جائے

فلمی دنیا کے مشہور و مقبول گلوکار

احمد رشدی

کی زندگی اور ان کے فن پر ایک مبسوط کتاب

(ان کے گائے ہوئے تمام نغمات کی مکمل فہرست کے ساتھ)

مرتب: رعنا اقبال

(عنقریب شائع ہورہی ہے)

ایک خط اور

شاہین (آٹووا۔کینیڈا)۔دسمبر ۹۸ء

ستمبر ۹۸ء کے شمارے میں شامل جناب حمایت علی شاعر کے خط سے اندازہ ہوا کہ میری طرح کچھ اور لوگوں نے ان کی خودنوشت اشعار پر اپنے ردعمل کا اظہار کیا ہے۔لیکن یوں جان پڑتا ہے کہ بات بڑھ کر خاصی سنگین ہوگئی ہے۔شعروادب کے معاملے میں اربابِ اقتدار کو کیا دخل؟ حریت فکر اور اظہار خیال پر انسان کا بنیادی حق ہے اسی طرح اختلافات رائے کا حق بھی نہاد انسانیت ہے شرط یہ ہے کہ یہ تمام باتیں مہذب پیرائے میں کی جائیں۔

خودنوشت کے اشعار اتنے مشکل نہیں کہ قارئین افکار کو انہیں سمجھنے میں دقت پیش آئے۔پھر بھی جناب حمایت علی شاعر شعروں کی تشریح اور وضاحت کرتے ہیں۔لیکن اس کوشش میں وہ کچھ اور الجھ کر رہ گئے ہیں۔پہلے تو وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ میں (شاہین) نے جن دو شعر کا اپنے خط میں حوالہ دیا تھا وہی دو اشعار کراچی میں بھی کچھ ایسے شعراء کو بہت گراں گزرے جن کا آبائی تعلق ہندوستان کے ایک مخصوص صوبے سے ہے۔اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ "یہ مخصوص ذہنیت کے لوگ صرف دو اشعار کی بناء جب میرے ساتھ یہ ہولناک سلوک کر سکتے ہیں تو اپنے بنگالی بھائیوں کے ساتھ کیا کچھ نہ کیا ہوگا۔" دیکھئے کہتے ہیں اس طرح سے سخن ور سہرا۔

جناب حمایت علی شاعر آگے چل کر مزید یوں رقم طراز ہوتے ہیں غیر بنگالی سے مراد وہ سب لوگ ہیں جو ہندوستان کے مختلف علاقوں سے جا کر وہاں آباد ہوئے اور وہ بھی جو مغربی پاکستان سے وہاں گئے اور جنہوں نے اس سرزمین سے رشتہ نہیں جوڑا۔لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ جناب حمایت علی شاعر کی تان ٹوٹتی ہے تو ہندوستان کے ایک خاص صوبے سے آبائی تعلق رکھنے والوں پر غیر منطقی طرز استدلال کی اس سے بہتر مثال اور کیا ہوگی۔یہ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ جناب حمایت علی شاعر شخصی اور شاعر کی حیثیت سے میرے نزدیک اب بھی اتنے ہی قابل احترام ہیں جتنا پہلے تھے اگر انہیں اپنے موقف پر اصرار ہے تو اس کا انہیں حق حاصل ہے اور کوئی اسے تبدیل کرنے پر انہیں مجبور نہیں کر سکتا۔

ایک طویل خط

ڈاکٹر محمد رضا کاظمی (کراچی)۔فروری ۹۹ء

جناب حمایت علی شاعر نے مجھ ناچیز کے اس مکتوب کا حوالہ دیا ہے جو انگریزی روزناموں

''مسلم'' اسلام آباد اور ''استار'' کراچی میں شائع ہوا ہے مگر اس خط میں جو دردمندی تھی اور جو دلائل تھے انہیں وہ نظر انداز کر گئے بہر حال ان کے موجودہ مراسلے کو لیجئے۔

''میں سوچتا ہوں کہ یہ مخصوص ذہنیت کے لوگ صرف دو اشعار کی بناء پر میرے ساتھ یہ ہولناک سلوک کر سکتے ہیں تو اپنے بنگالی بھائیوں کے ساتھ کیا کچھ نہ کیا ہوگا..... بات مجموعی طرز عمل کی ہے تاریخ مجموعی عمل کی گواہی دیتی ہے۔ میں نے اپنے اشعار میں غیر بنگالیوں کے اسی کردار و عمل کی طرف اشارہ کیا تھا۔

یہاں پہ جو بھی تھے آباد غیر بنگالی
تھے ڈھول کی طرح ان کے بھی اندروں خالی
یہ ڈھول بجتے تھے باہر کی ضرب سے اکثر
وہ بے خبر رہے اندر کے کرب سے اکثر.....''

بات صرف دو اشعار کی نہیں زیادہ قابل اعتراض بیت یہ ہے

ہر اک کھلونے کی چابی تھی انڈیا میں کہیں
بنا تھی ساری خرابی کی انڈیا میں کہیں

''غیر بنگالیوں'' کا جو بھی مجموعی طرز عمل رہا، ان کے حریفوں نے انہیں ''پنجابیوں کا گماشتہ'' اور ''پاکستانی فوج کا ساتھی'' کہا تھا۔ جن کھلونوں کی چابی بھارت کے ہاتھ میں تھی وہ اپنے فخریہ اقرار کے مطابق عوامی لیگ کے کارکن اور مکتی باہنی تھے۔ ان کارکنوں نے ۱۹۵۴ء میں نرائن گنج میں جوٹ مل مزدوروں کو جو غیر بنگالی تھے بھٹی میں زندہ جلا دیا۔ ۱۹۶۵ء میں چٹاگانگ میں ایک بنگالی لڑکے اور خوجہ لڑکی کے معاشقے کی پاداش میں ہزاروں کی تعداد میں غیر بنگالیوں کو قتل کر دیا۔ ۱۹۷۰ء میں انتخابات سے قبل بھی فسادات ہوئے تھے۔ یکم مارچ ۱۹۷۱ء کو جب جنرل یحییٰ خان نے آئین ساز اسمبلی کا اجلاس ملتوی کیا اس وقت سے ۲۵ مارچ تک عوامی لیگ کے کارندوں نے ہزاروں لاکھوں بے گناہ مردوں عورتوں اور بچوں کو قتل کر ڈالا۔ اس نسل کشی کی گواہی جناب ذوالفقار علی بھٹو نے اقوام متحدہ کے روبرو دی۔ آپ کے معاصر ''نقوش''۔ لاہور میں شیخ منظور الٰہی نے وہاں کے حالات قلمبند کئے۔ غیر بنگالیوں کے قتل عام کی خبریں بیرونی خصوصاً یورپی روزناموں میں اب بھی محفوظ ہیں۔ کسی قرطاس ابیض کی محتاج نہیں، کسی بھی موقع پر ان ''مخصوص ذہنیت'' کے غیر بنگالیوں نے کشت و خون میں پہل نہیں کی۔ جہاں جہاں وہ مدافعت کے قابل رہے اور مدافعت پر مجبور رہے تو دنیا کے کسی قانون کے تحت وہ موردِ الزام نہیں ٹھہرتے۔

جناب حمایت علی شاعر آگے چل کر فرماتے ہیں۔

''بدگمانیاں اور نفرتیں بے سبب پیدا نہیں ہوتیں ہمیں دوسروں پر الزام رکھنے سے پہلے اپنا چہرہ بھی آئینے میں دیکھ لینا چاہئے۔''

بجا ارشاد۔ میں ان کا جملہ سقوط مشرقی بنگال سے سقوط حیدرآباد دکن کی جانب منتقل کرتا ہوں ''بدگمانیاں اور نفرتیں'' بے سبب پیدا نہیں ہوتیں۔ یقیناً حیدرآباد دکن کی مسلم اقلیت نے وہاں کی ہندو اکثریت کے ساتھ ایسا سلوک روا رکھا ہوگا جو سقوط حیدرآباد کی نوبت آئی۔ ایک غیر بنگالی مورخ Jan Coupland کے مطابق ۱۹۳۷ء سے لے کر ستمبر ۱۹۴۰ء تک آٹھ ہندو مسلم فسادات برپا ہوئے۔ وہاں کے مسلمانوں نے وہاں کے ہندوؤں کے ساتھ ایسا ہی تحقیر آمیز سلوک کیا ہوگا۔ جو وہاں کے ہندو کشت وخون پر آمادہ ہوگئے۔ ایک مقامی اخبار نے تو یہاں تک لکھا کہ ''حیدرآباد ایک ایسی ریاست ہے جہاں ہندو ہونا جرم ہے۔'' ان شواہد اور جناب حمایت علی شاعر کی منطق کی رو سے سقوط حیدرآباد کی ذمے داری مجاہد دکن قاسم رضوی اور اتحاد المسلمین پر عائد ہے۔

اگر جناب حمایت علی شاعر نے یہ لکھا ہوتا کہ غیر بنگالیوں کی چابی مغربی پاکستان یا اس کے کسی صوبے کے ہاتھ میں تھی (جیسا کہ بعد کی وضاحت سے متشرح ہے) تو دکھ کی بات نہ ہوتی غیر بنگالیوں اور پاکستانی فوج کے عاقبت نااندیشوں کو صبح شام نشانہ بنایا جاتا ہے اور ہم اس کے خوگر ہیں اعتراض یہ ہے کہ ہماری حب الوطنی کو نشانہ بنایا گیا ہے۔

لو وہ بھی کہہ رہے ہیں کہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

جناب حمایت علی شاعر کی یہ نمک پاشی بھی قابلِ غور ہے۔

''حاشیوں میں' میں نے تاریخی حوالے بھی دیئے ہیں۔''

ایک حاشیہ ملاحظہ ہو۔

''پاکستان کے پہلے وزیراعظم شہید ملت لیاقت علی خان اپنے پڑوسی ملک روس کی دعوت کو نظر انداز کر کے ۲/مئی کو امریکہ چلے گئے اور ''دوستی'' کا معاہدہ کر آئے۔''

(افکار۔ مئی ۱۹۹۸ء۔ ص ۱۸)

یہ سراسر بہتان ہے۔ روس نے امریکہ کی جانب سے نہرو کو دعوت کے ردِعمل میں لیاقت علی خان کو دعوت دی جو فوراً قبول کر لی گئی۔ مگر بعد ازاں سوویت روس نے سرد مہری اختیار کی۔ انہوں نے وزیراعظم پاکستان کے بارہا استفسار پر دورے کی کوئی تاریخ مقرر نہ کی۔ یہاں تک کہ ان کی شہادت واقع ہوگئی۔ سابق سفیر سید ارتضیٰ حسین اخبار ''ڈان'' میں اس بے بنیاد الزام کے

دستاویزی ثبوت کے ساتھ دو الگ موقعوں پر تردید کر چکے ہیں۔ اب یہ مضامین ان کی کتاب Conciliation with compromise میں یک جا شائع ہو چکے ہیں اور ابھی حال ہی میں جناب حسن ظہیر نے اپنی انگریزی تصنیف راولپنڈی سازش ۱۹۵۱ء میں اصل مسئلوں کی بنیاد پر اس غیر ذمے دارانہ الزم کی قلعی کھول دی ہے۔ لیاقت علی خان نے امریکہ کے ساتھ دوستی کا کوئی معاہدہ نہیں کیا۔ اپنی شہادت سے صرف چار دن قبل امریکی سفیر آواوارن کے ایسے اصرار کو لیاقت علی خان نے سختی سے رد کر دیا تھا۔ امریکہ سے معاہدہ جناب ملک غلام محمد کے زمانے میں طے پایا تھا۔

بات دو اشعار کی نہیں جناب حمایت علی شاعر نے اپنے مراسلے میں پانچ اشعار نقل کیے ہیں۔ جن میں وہ بیت بھی شامل ہے جس کا میں نے حوالہ دیا ہے انہوں نے اپنے اشعار کی جو تشریح اب کی ہے اگر پہلے ہی حاشیوں میں کر دیتے تو بلاغت کا خون نہ ہوتا۔ ویسے یہاں بھی جناب شاعر کا ایک جملہ محل نظر ہے۔

''ان لوگوں کو غدار کہنا جو تحریک پاکستان میں پیش پیش رہے کہاں تک درست ہے۔''

آپ کے مذکورہ اشعار پر ہمارا یہی تو اعتراض ہے۔ خیر جہاں تک بنگالیوں کا تحریک پاکستان میں پیش پیش ہونے کا تعلق ہے تو وہ اس لئے تھا کہ وہ خوب سمجھتے تھے کہ ایک کمزور پاکستان میں ایک مضبوط ہندوستان کی نسبت بنگالی قومیت کے پروان چڑھنے کے زیادہ امکانات ہیں۔ میرے اس مراسلے میں جس کا از راہ عنایت حمایت علی شاعر نے حوالہ دیا ہے اس کی تصریح موجود ہے۔

جناب حمایت علی شاعر نے عدالت عالیہ کے اس فیصلے کا حوالہ دیا ہے کہ جس کی رو سے جنرل آغا محمد یحییٰ جن کی حکومت غیر قانونی تھی۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ پاکستان سے مشرقی بازو کا الحاق بھی غیر آئینی تھا۔ اگر غیر بنگالیوں نے پاکستان کی سالمیت کی خاطر پاکستانی فوج سے تعاون کیا تو یہ بنگال کے نقطہ نظر سے غیر آئینی ہو سکتا ہے۔ پاکستان کے نقطہ نظر سے غیر آئینی نہیں ہو سکتا خصوصاً جیسا کہ صراحت کی جا چکی ہے۔ کہ کبھی بھی پہل کرنے والوں میں نہیں تھے۔ جناب حمایت علی شاعر نے اپنے مراسلے میں اپنی جو ایک بیت پیش کی ہے وہ لاجواب ہے۔

جس طرح حمایت علی شاعر کی تشریح ان کے اشعار کے تین ماہ بعد آ رہی ہے اسی طرح ان کی تنبیہ بھی بعد از وقت ہے۔ جناب حمایت علی شاعر پر بھی لازم ہے کہ وہ ہمارا مجموعی طرز عمل دیکھیں صرف دو اشعار پر ہمارے رد عمل کو نہ دیکھیں۔ ان کے کلام کی مجموعی قدر و قیمت کے کل بھی قائل تھے اور آج بھی قائل ہیں۔ ان کے اس مطلع کی داد ہم نے وہاں بھی دی تھی یہاں بھی دے رہے ہیں۔

ہر قدم پر نت نئے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں لوگ
دیکھتے ہی دیکھتے کتنے بدل جاتے ہیں لوگ

شاہین کے نام

حمایت علی شاعر (نیویارک)۔فروری ۹۹ء

بھائی نکہت وصہبا۔سلام مسنون

میں ۱۲ نومبر کو کراچی سے نیویارک پہنچا اور اب امریکہ اور کینیڈا کے مختلف شہروں سے ہوتا ہوا ۲۰ دسمبر کو پھر نیویارک آ گیا ہوں۔ میں نے آپ کے خطوط احباب متعلقہ تک پہنچا دیئے کچھ حضرات نے افکار کے لئے زر رفاقت بھی عنایت کیا ہے۔ میں پاکستان آ کر آپ کو پہنچا دوں گا (انشاءاللہ جنوری کے پہلے ہفتے میں)

۱۴ نومبر کو یہاں میرا ''جشن'' منایا گیا صدارت محترم احمد ندیم قاسمی نے فرمائی اور ایک مضمون بھی پڑھا۔ قاسمی صاحب ان شخصیتوں میں سے ہیں جن سے ہماری نسل نے بہت کچھ سیکھا یوں تو انہوں نے پہلے بھی مجھے نوازا ہے مگر اس بار جن الفاظ میں سراہا مجھ میں ایک اور چراغ روشن ہو گیا۔ ہر چند کہ میں بھی اپنے بعد آنے والی نسل کے ''بزرگوں'' میں شمار ہوتا ہوں مگر ہر بزرگ ''بڑا آدمی'' نہیں ہوتا خدا کرے میں قاسمی صاحب کے ان الفاظ کی لاج رکھ سکوں۔ یہ تقریب ''حلقہ بن وادب'' کے زیر اہتمام تھی جو نیویارک کی ایک فعال ادبی تنظیم ہے جو گذشتہ بارہ سال سے ''یوم اقبال'' منا رہی ہے اب تک کئی شخصیتوں کے جشن بھی منا چکی ہے۔ مثلاً احمد ندیم قاسمی، علی سردار جعفری، جگن ناتھ آزاد، کیفی اعظمی، راغب مراد آبادی اور قتیل شفائی وغیرہ۔ اس ادارے کے صدر غزل کی کلاسیکی روایت کے مستند اور بزرگ شاعر سید محمد حنیف اخگر ملیح آبادی ہیں جن کے اب تک دو شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں ''چراغاں اور خیاباں'' ان کا ایک شعر سناؤں کہ ہمارے مزاج کا بھی آئینہ دار ہے۔

دشمنوں پر اگر وقت کوئی پڑا
دوستوں کی طرح پیش آئیں گے ہم

میرا منظوم سوانح حیات ''آئینہ در آئینہ'' یہاں بھی بہت دلچسپی کے ساتھ پڑھی جا رہی ہے۔ دسمبر کے شمارے میں آپ نے شاہین کا ایک اور خط شائع کر دیا۔ انہیں گمان ہے کہ میں نے بہاریوں کا ذکر کسی ''خاص معنی'' میں کیا ہے۔ ایسا نہیں ہے ''مخصوص ذہنیت'' سے مراد وہ انداز فکر جو کسی ''زمین'' پر رہ کر بھی اس سے وابستہ ہونے نہیں دیتا۔ اپنے ''برہمنی مزاج'' کے سبب کچھ لوگ

تہذیبی طور پر اپنے آپ کو دوسروں سے ارفع اور اعلیٰ سمجھتے ہیں۔ ایسے لوگ ''خدا جانے'' کیوں ہم اردو والوں میں بہت ملتے ہیں۔ اتفاق سے میرے دو اشعار۔

وہاں پہ جو بھی تھے آباد غیر بنگالی
تھے ڈھول کی طرح ان کے بھی اندروں خالی
یہ ڈھول بجتے تھے باہر کی ضرب سے اکثر
وہ بے خبر رہے اندر کے کرب سے اکثر

جن ''غیر بنگالیوں'' کو بہت گراں گزرے وہ اتفاق سے سبھی ''بہاری'' نکلے کسی ''غیر بہاری'' نے آج تک کوئی اعتراض نہیں کیا۔

ویسے آپ جانتے ہیں کہ ''بہار'' سے آبائی تعلق رکھنے والے کتنے ہی ''اہل قلم'' ہیں جن کا میں دل سے معترف ہوں۔ کچھ پر میں نے مضامین بھی لکھے ہیں۔ بزرگوں میں پرویز شاہدی اور حمید عظیم آبادی وغیرہ اور یہاں حسن حمیدی، کمال احمد رضوی، مسعود دارمان، نظیر صدیقی، پروین شاکر اور شاہدہ حسن وغیرہ کئی میرے دوست ہیں۔ اظہر قادری، ادیب سہیل اور مسلم سیم ان میں کسی پر اس ذہنیت کا اطلاق نہیں ہوتا، خود شاہین کے بارے میں، میں بہت اچھی رائے رکھتا ہوں۔ ہمارے مراسم گھروں تک رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ مجھ سے کوئی ''چھوٹی بات'' منسوب نہیں کریں گے۔ میں تو مذہبی تعصبات کا بھی قائل نہیں ہوں بھائی علاقائی اور لسانی خانوں میں کیسے بٹ سکتا ہوں۔ جن حضرات نے میرے خلاف گذشتہ چھ مہینے مختلف اردو انگریزی اخبارات و رسائل میں مہم چلائی اور مجھے ہر طرح سے بدنام کرنے اور نقصان پہنچانے کی کوشش کی ان میں (دو ایک معروف لوگوں کے علاوہ) میں کسی کو نہیں جانتا اس لئے جواب سے گریز کیا۔ تکبیر اور جسارت میں بھی صرف اس لئے جوابی تحریریں لکھیں کہ وہ ایک خاص سیاسی اور مذہبی نقطہ نگاہ کے ترجمان ہیں اور ان کا ایک حلقہ اثر بھی ہے۔ ان میں پہلے بھی میرے خلاف بہت سی بے بنیاد باتیں چھپتی رہی ہیں (ملاحظہ ہوں شخص و عکس اور احوال واقعی)

جو لوگ اب میرے خلاف صف آراء ہیں وہ یقیناً میرے کسی ''کرم فرما'' کے فرستادہ ہیں اگر وہ ادب کے سنجیدہ اور باخبر لوگ ہوتے تو میری نظم ''مارچ پاسٹ ۷۱ء'' اور ''لہو'' کے بارے میں یہ نہ لکھتے کہ یہ نظمیں میری کسی کتاب میں نہیں ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ یہ دونوں نظمیں میرے دوسرے مجموعہ کلام ''مٹی کا قرض'' (مطبوعہ ۷۴ء) میں شامل ہیں اور اس کتاب کو رائٹرز گلڈ'' کا ''آدم جی ادبی ایوارڈ'' بھی مل چکا ہے (اس کتاب کے اب تک پاکستان میں تین اور ہندوستان میں دو ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں چوتھا ایڈیشن بھی انشاء اللہ جلد ہی اہل نظر کے ہاتھوں میں ہوگا)

ایسے لوگوں کے بارے میں کیا لکھوں۔

حلقہ بگوش رہ کے کٹی جن کی زندگی
وہ کیا سمجھ سکیں گے مقام خود آگہی

اس بار اپنی سوانح کا وہ حصہ بھی بھیج رہا ہوں جو ''مشرقی پاکستان'' سے متعلق ہے اسے بہت پہلے چھپ جانا چاہئے تھا مگر خیر دیر آید درست آید علامہ اقبال نے کہا تھا۔

کبھی بھولی ہوئی منزل بھی یاد آتی ہے راہی کو

ابھی (سڈبری سے) عبدالقوی ضیاء کا فون آیا تھا تفصیلی بات ہوئی۔ نیوجرسی میں محترمہ رشیدہ عیاں شمیم حیدر فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام ضیاء کا جشن منانا چاہتی ہیں میرا تعاون کیسے حاصل نہ ہوگا۔ ہم دونوں حیدرآباد (سندھ) میں ۵۵ء کے دوست ہیں..... یک جان دو قالب۔ میں نے رشیدہ عیاں سے وعدہ بھی کرلیا ہے۔ اوج کمال بھی دنیائے ادب کے ضخیم ''جمیل الدین عالی'' کے بعد ویسا ہی عبدالقوی ضیاء نمبر نکالے گا۔ اللہ تعالیٰ اس کے حوصلہ بلند رکھے۔ میری طرح وہ بھی علی سردار جعفری کے اس شعر کو اپنا Motto بنائے ہوئے ہے۔

دامن جھٹک کے منزل غم سے گزر گیا
اٹھ اٹھ کے دیکھتی رہی گردِ سفر مجھے

رضا کاظمی کے نام

حمایت علی شاعر (کراچی) اپریل ۹۹ء

بھائی صہبا ونکہت..... سلام مسنون

اس سے پہلے کہ اصل موضوع کی طرف آؤں۔ ایک غلطی کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں ''افکار'' مارچ ۹۹ء کے ''البم'' میں مشہور شاعر نوشاد نوری کی تصویر کے نیچے مشہور افسانہ نگار احمد سعدی کا نام چھپ گیا ہے۔ آپ بھی دونوں حضرات کو خوب جانتے ہیں اور میں تو کچھ ہی برس پہلے بنگلہ دیش میں (ایشین پوئٹری فیسٹول کے دوران) دونوں دوستوں سے مل چکا ہوں۔ قارئین کرام اس غلطی کو درست کرلیں۔

اس شمارے میں ڈاکٹر رضا کاظمی کا ایک طویل خط چھپا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ یہ سلسلہ مئی ۱۹۹۸ء میں شائع ہونے والی اس قسط سے چل رہا ہے جس میں مشرقی پاکستان کے بنگلہ دیش بننے کے محرکات کا میں نے جائزہ لیا تھا۔ تب سے اب تک ایک مخصوص ادبی گروپ نے میرے خلاف مہم شروع کر رکھی ہے۔ مختلف اخبارات و رسائل میں مراسلہ بازی ہو رہی ہے۔ طویل طویل ہجویہ نظمیں لکھی جا رہی ہیں اور ناشائستگی کی حد تک مجھ پر الزامات عائد کئے جا رہے ہیں۔ رضا صاحب

اس گروپ کے فرستادہ تو نظر نہیں آتے مگر موصوف نے بھی پہلے اسلام آباد اور کراچی کے انگریزی اخبارات میں یہ موضوع چھیڑا پھر افکار کی طرف متوجہ ہوئے خدا کا شکر ہے کہ انہوں نے مجھے ہندوستان کا ایجنٹ یا پاکستان کا دشمن نہیں کہا اور نہ میرے دین وایمان کو اپنے ترازو میں تولا۔ اس لئے مجھے ان کا شکریہ ادا کرنا چاہئے۔ خط کا لہجہ بھی شائستہ ہے اس لئے ان کے خط کا جواب دینا میں اپنا اخلاقی فرض سمجھتا ہوں۔

رضا صاحب کے قلم سے دانستہ یا نادانستہ کچھ ایسی باتیں نکل گئیں جو مشرقی پاکستان میں آباد غیر بنگالیوں کے طرز عمل اور اندازِ فکر کا آئینہ دکھاتی ہیں' وہ لکھتے ہیں۔

''غیر بنگالیوں کا جو بھی طرز عمل رہا ہو ان کے حریفوں نے انہیں ''پنجابیوں کا گماشتہ'' اور پاکستانی فوج کا ساتھی کہا تھا۔''

پھر رضا صاحب نے اس وابستگی کا اقرار کرتے ہوئے اطمینان کا اظہار بھی کیا' لکھتے ہیں۔

''اگر جناب حمایت علی شاعر نے یہ لکھا ہوتا کہ غیر بنگالیوں کی چابی مغربی پاکستان کے کسی صوبے کے ہاتھ میں ہے (جیسا کہ بعد کی تشریح سے مترشح ہے) تو دکھ کی بات نہ ہوتی۔''

حالانکہ یہی بات میں نے اشعار میں کہی تھی جو اتفاق سے کچھ لوگ سمجھ نہ سکے اور اس میں پوشیدہ طنز سے تلملا اٹھے (اگرچہ وہ طنز ملیح تھا)

سوال پیدا ہوتا ہے کہ مشرقی پاکستان میں رہ کر غیر بنگالیوں نے یہ طرز عمل کیوں اختیار کیا اس کا جواب ان کے اندازِ فکر میں پوشیدہ ہے رضا صاحب لکھتے ہیں۔

''جہاں تک بنگالیوں کا تحریک پاکستان میں پیش پیش ہونے کا تعلق ہے تو وہ اس لئے تھا کہ وہ خوب سمجھتے تھے کہ ایک کمزور پاکستان میں..... ایک مضبوط ہندوستان کی بہ نسبت بنگالی قومیت کے پروان چڑھنے کے زیادہ امکانات ہیں۔''

جب سوچنے کا یہ انداز ہوگا تو ''بدگمانیاں'' بھی پیدا ہوں گی اور منفی احساسات بھی سر اٹھائیں گے۔ زبان اور تہذیب تاریخ کی دین ہوتی ہے۔ اس سے محبت فطری ہے۔ اس محبت کو پاکستان یا اسلام کے خلاف سمجھنا دونوں کو نہ سمجھنے کے مترادف ہے۔ ''غیر بنگالیوں'' کی مقامی لوگوں سے دوری اور مفاہمت مسائل سے لاتعلقی میں یہی ''اندازِ فکر'' حائل رہا۔ مزید برآں کچھ ''خوش فہمیاں'' اور کچھ ''خود ساختہ معلومات'' بھی باہم یگانگت کی فضا پیدا کرنے میں رکاوٹ بنے رہے اور ''غیر بنگالی'' مغربی پاکستان کے ان ارباب سیاست کے ہمنوا بنے رہے جو ''مشرقی پاکستان'' کو ایک ''کالونی'' بنائے رکھنا چاہتے تھے۔ میں نے اپنے اشعار میں اسی طرف اشارہ کیا تھا۔

وہاں پہ جو بھی تھے آباد غیر بنگالی

تھے ڈھول کی طرح ان کے بھی اندروں خالی
یہ ڈھول بجتے تھے باہر کی ضرب سے اکثر
وہ بے خبر رہے اندر کے کرب سے اکثر

مقامی لوگوں نے جب بھی اپنی کسی حق تلفی پر آواز اٹھائی تو انہیں ہندوستان کا ایجنٹ کہہ دیا گیا ان کے ہر احتجاج کے پیچھے ''غیر بنگالیوں'' کو انڈیا کا ہاتھ نظر آیا۔

ہر اک چیخ کی بابت خیال تھا ''ان کا''
وہ آدمی نہ تھا ''چابی'' بھرا کھلونا تھا
ہر اک کھلونے کی چابی تھی انڈیا میں کہیں
بنا تھی ساری خرابی کی انڈیا میں کہیں

اسے ہم اپنی قومی کمزوری کہیں کہ ''اہل سیاست کا ہنر''..... اپنی خرابی کے اسباب اپنے افعال میں ڈھونڈنے کے بجائے ہم دوسروں کے ''اعمال'' میں تلاش کرتے ہیں۔ اپنی خامیوں کا ذمہ دار دوسروں کو ٹھہراتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خامی تو اپنی جگہ رہتی ہے اور دوسرا اپنا ہنر دکھا جاتا ہے۔ مشرقی پاکستان میں بھی یہی کچھ ہوا ہے۔

سو انڈیا نے کیا وہ جو اس کی خواہش تھی
وہاں ہمارا وطن توڑنے کی سازش تھی
بالآخر اس نے چلی چال ایک ایسی بھی
کہ سانپ بھی مرے لوٹے نہ اس کی لاٹھی بھی

چنانچہ دنیا نے دیکھ لیا کہ بنگالیوں کے ہاتھوں ''بنگلہ دیش'' بن گیا اور ہم نے تاریخ کی سب سے بڑی شکست اور ذلت اٹھالی۔ ہمارے (۹۳) ہزار سپاہی ہندوستان کے قیدی بنا دیئے گئے۔ ڈاکٹر رضا صاحب نے خود لکھا ہے۔

''غیر بنگالیوں اور پاکستانی فوج کے عاقبت نااندیشوں کو صبح وشام نشانہ بنایا جاتا ہے اور ہم اسکے خوگر ہیں۔''

اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ موضوع زیر بحث آتا رہا ہے اور کیوں نہ آئے آخر تاریخ کا اتنا بڑا سانحہ ہے۔ ایک ملک اور ایک نظریے پر ضرب پڑی ہے۔ اب بھی اگر ہم ہوش میں نہ آئیں تو کب آئیں گے۔

یہاں بھی رضا صاحب نے میرے کسی شعر کا الٹا مطلب سمجھ لیا اور مجھے الزام دیا' لکھتے ہیں۔

''اعتراض یہ ہے کہ ہماری حب الوطنی کو نشانہ بنایا گیا ہے''..... (پھر غالب کا شعر لکھا ہے)

لو وہ بھی کہہ رہے ہیں کہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

یہ سطریں پڑھ کر پہلے تو مجھے فیض صاحب کا ایک شعر یاد آ گیا۔

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہیں
وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

پھر غالبؔ کی اسی غزل کے ایک شعر نے نکتے کی بات سجھادی۔

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہرو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

سارا مسئلہ یہی ہے کہ ہم ان صوبوں سے شاکی رہے جنہیں تحریک پاکستان میں ''اولیت'' کا مقام حاصل تھا۔ ۳۰ دسمبر ۱۹۰۶ء میں ڈھاکا میں مسلم لیگ قائم ہوئی اور ۱۹۳۸ء میں سندھ اسمبلی نے سب سے پہلے ''قرارداد پاکستان'' منظور کی (یہ قرارداد جی ایم سید کی ایماء پر عبدالمجید سندھی نے پیش کی تھی یہ اور بات کہ اس کا ذکر نہیں کیا جاتا)۔

پاکستان کے یہ علاقے صدیوں سے ہیں اور سب مسلم اکثریت کے علاقے ہیں۔ ان سب کے اشتراک سے پاکستان وجود میں آیا ہے اور ان سب نے اپنی زبانیں اور تہذیبیں ہونے کے باوجود اردو کو اپنی ''قومی زبان'' بنایا البتہ جب ان کے علاقوں میں ان کی ''ترقی یافتہ زبانوں'' کو ان کا ''مقامی حق'' بھی نہیں دیا گیا تو انہوں نے احتجاج کیا۔ یہ ''اردو یا پاکستان'' دشمنی نہیں اپنے حق کی مانگ تھی۔ ہمارے رہنمایانِ کرام نے اسے اردو کے جنازے سے تعبیر کیا جو ان کی کوتاہ فہمی تھی۔ ایک مشترک معاشرے میں وسیع القلبی اور تہذیبی و تاریخی شعور کی شدید ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے بغیر قومی یک جہتی قائم نہیں ہو سکتی (کاش ان کے حقوق کی جدوجہد میں ہم بھی شامل ہوتے)

دراصل ہمارے ذہن و مزاج ''شاہی روایتوں'' کے تربیت یافتہ ہیں۔ اس ''لعنت'' نے ہم میں خلافتی اور جمہوری انداز میں سوچنے کی عادت نہیں پڑنے دی (ہمارے ملک میں آمریت کا ایک جواز یہ بھی ہے)

میں نے جنرل یحییٰ خان کی حکومت کو غیر آئینی اور غیر قانونی قرار دینے کے بارے میں سپریم کورٹ کے فیصلے کا جواز اسی غرض سے دیا تھا کہ اگر وہ ''منتخب حکومت'' ہوتی تو سیاست کے اہلِ دانش سوچ سمجھ کر قدم اٹھاتے اور پاکستان کو یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ رضا صاحب نے اسکے بھی ڈانڈے ایک غیر متعلق مسئلے سے ملا دیئے۔ پاکستانی علاقوں کے الحاق کو موضوع بنایا جائے گا تو یہ

بات بہت دور تک چلی جائے گی۔ اس لئے گفتگو کو موجودہ محدود مسائل تک ہی رکھا جائے تو مناسب ہوگا۔

ہر معاشرہ فطرتِ انسانی کا پابند ہوتا ہے۔ ایک چھوٹی سی مثال پیش کروں بہت پہلے میں نے ایک ''ثلاثی'' میں یہ بات کہنے کی کوشش کی تھی عنوان تھا ''کشش ثقل''

آزاد کب ہوا کوئی قیدِ مقام سے
جالندھری ہے کوئی تو کوئی ہے لکھنوی
ترکِ وطن کے بعد بھی نسبت ہے نام سے

(مٹی کا قرض ۱۹۷۴ء)

آج بھی پاکستان میں محلّے کے محلّے ہندوستانی شہروں اور علاقوں کے نام سے آباد ہیں اور یہ کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں ہے۔ نہ اس سے کسی کی ''حب الوطنی'' پر حرف آتا ہے۔ یہ فطرت انسانی کا تقاضہ ہے۔ اس کے علاوہ کچھ تقاضے وقت کے ہوتے ہیں۔ جس طرح سینکڑوں سال پہلے عرب وعجم سے آئے ہوئے مسلمانوں کی نسلیں ہندوستانی علاقوں سے منسوب ہوگئیں اور ان کی تاریخ کا حصہ بن گئیں۔ اسی طرح ہماری آئندہ نسلوں کی شناخت بھی ایک دن مقامی ہوجائے گی۔ وہ لوگ اپنے پاکستانی علاقوں کی نسبت سے پہچانے جائیں گے۔ پاکستان اسی کثرت میں وحدت کے تعین کا نام ہے۔ جیسے ہم ہزاروں ''خاندانی لاحقوں'' کے باوجود ''مسلمان'' ہیں۔ ہر وجود کی اکائی اپنے اجزاء کی پابند ہوتی ہے اس لئے اجزاء بھی مقدم ہوتے ہیں۔

رضا صاحب نے لیاقت علی خان کے امریکہ جانے کے بارے میں میری ایک ''غلط فہمی'' بھی دور کرنے کی کوشش کی ہے اور ''حال'' میں چھپنے والی دو کتابوں کے حوالے دیئے ہیں۔ کاش وہ کتابیں ''شہید ملت'' کی زندگی یا گورنر جنرل پاکستان ملک غلام محمد کے ''دورِ اقتدار'' میں چھپ جاتیں۔ مجھے اس سے غرض نہ تھی کہ امریکہ سے ''باضابطہ دوستی'' کا معاہدہ کس کے دور میں ہوا۔ ۱۹۷۱ء میں امریکی بحری بیڑے کی بڑی آس تھی ..... میں نے بھی اسی سال ایک نظم ''مارچ پاسٹ ۷۱ء'' لکھی تھی جس کا آخری بند یہ تھا۔

یہ جنگ کس کی جنگ ہے خود اس وطن سے پوچھیے
وطن سے دور ''دوستوں کی انجمن'' سے پوچھیے
جبیں جبیں پہ مضطرب شکن شکن سے پوچھیے
خدا بنا ہوا ہے جو اس اہرمن سے پوچھیے
ہوائیں چیختی پھریں..... انارکی..... انارکی

یہ زرگری کی جنگ ہے یہ جنگ اقتدار کی

پھر رضا صاحب نے سقوطِ ڈھاکا کے ڈانڈے ''سقوط حیدرآباد دکن'' سے ملا دیئے اور سید قاسم رضوی کو بیچ میں لے آئے۔ قاسم رضوی ایک جوشیلے مسلمان ضرور تھے مگر بڑے سیاست دان نہیں تھے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس ریاست میں ایک ''بادشاہ'' کی حکومت تھی اور حفیظ جالندھری کے شاہنامہ اسلام کے بارے میں جوش ملیح آبادی کا یہ شعر تو رضا صاحب نے بھی سنا ہوگا۔

اسلام کا شاہنامہ لکھنے والے
اسلام کا شاہی سے تعلق کیا ہے

سو مسئلہ ''اسلامی'' بھی نہیں تھا۔ وہاں مسلمان تیرہ یا چودہ فی صد تھے۔ باقی غیر مسلم تھے۔ یہ ریاستیں انگریزوں نے اپنی سیاسی مصلحتوں اور ضرورتوں کے تحت قائم کر رکھی تھیں۔ آزادی کے بعد ان کا فیصلہ ایک خاص سیاسی تدبر کا متقاضی تھا۔ جو اتفاق سے ہمارے ''جوشیلے رہنماؤں'' میں نہیں تھا۔ نتیجہ سامنے ہے۔

ہر مسئلے کو ایک ہی زاویئے سے دیکھنا کوتاہ بینی ہے۔ ہندوستان میں آج پاکستان سے زیادہ مسلمان ہیں۔ ہمیں ان کا بھی خیال رکھنا چاہیئے اور پاکستان کی بقاء اور قومی یک جہتی کا بھی..... ادھر ''بنگلہ دیش'' بھی مسلمانوں کا ہی ملک ہے اور آبادی کے لحاظ سے ہم سے بڑا ہے (خدا سب کو سلامت رکھے)

آخر میں رضا کاظمی صاحب لکھتے ہیں۔

''جس طرح حمایت علی شاعر کی تشریح ان کے اشعار کے تین ماہ بعد آ رہی ہے اس طرح ان کی تنبیہ بھی بعد از وقت ہے۔''

جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا مذکورہ قسط مئی ۹۸ء میں چھپی تھی۔ اگست ۹۸ء میں شاہین کا خط چھپا اور ستمبر ۹۸ء میں' میں نے اس کا جواب دے دیا۔ ویسے میری سوانح حیات 'اگست ۱۹۹۵ء سے ہر ماہ قسط وار افکار میں چھپ رہی ہے۔ اب تک ڈھائی ہزار سے زیادہ اشعار چھپ چکے ہیں۔ یہ میری آپ بیتی بھی ہے اور اپنے ملک کی تاریخ بھی۔ ظاہر ہے کہ اس کا اظہار ''اک آگ کا دریا ہے اور تیر کے جانا ہے'' کے مصداق ہوگا۔ اس میں حالات کا تجزیہ بھی ہوگا۔ مجاہدہ بھی اور محاکمہ بھی..... اتفاق سے منظوم لکھ رہا ہوں تو کچھ شعری تقاضے بھی گل کھلائیں گے۔ میں نے سقوط حیدرآباد کا احوال بھی لکھا ہے (ملاحظہ ہو قسط نمبر ۱۱ اور نمبر ۱۲)

آخر میں یہ بھی عرض کر دوں کہ میرے خلاف جو کچھ بھی لکھا جا رہا ہے۔ اگر اس میں ''بدنیتی''

شامل نہ ہوتو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ نظریات میں اختلاف بھی ہوتا ہے مگر وہ ''مخالفت'' جو کسی کو نقصان پہنچانے کے لئے کی جاتی ہے ''کمینگی'' کے مترادف ہے اور میرے ساتھ یہی ہوا ہے۔ افسوس کہ کراچی کے جس نام نہاد پندرہ روزہ ادبی اخبار نے باضابطہ نیت باندھ کر میرے خلاف یہ سلسلہ شروع کیا ہے۔ اس کے مشیروں میں میرے بعض دوستوں کے نام بھی شامل ہیں اور وہ ہیں پروفیسر آفاق صدیقی، پروفیسر نظیر صدیقی اور پروفیسر علی حیدر ملک۔ یہ اور بات کہ ان احباب نے اپنے نام سے کچھ نہیں لکھا مگر اپنے اخبار کی کسی تحریر کی تردید یا اس اخبار سے لاتعلقی کا اظہار بھی نہیں کیا۔ رضا صاحب نے میری جس غزل کا مطلع لکھا ہے اس کا ایک مقطع بھی ہے۔

شاعر ان کی دوستی کا اب بھی دم بھرتے ہیں آپ
ٹھوکریں کھا کر تو سنتے ہیں سنبھل جاتے ہیں لوگ

میرا کوئی جھگڑا نہیں

آفاق صدیقی (کراچی)۔ جون ۹۹ء

اپریل ۹۹ء کا شمارہ افکار نظر نواز ہوا۔ دلی شکریہ۔ حسب معمول حمایت صاحب کی منظوم خودنوشت پڑھی پھر جستہ جستہ تمام خیال افروز و ادب آموز تحریروں سے کسب فیض کیا۔ لیکن جب یاران محفل تک پہنچا تو بھائی حمایت علی شاعر کے طویل خط کی یہ سطور گراں گزریں جو ''بساطِ ادب'' کے حوالے سے ہیں موصوف لکھتے ہیں۔

''آخر میں یہ بھی عرض کر دوں۔ میرے خلاف جو کچھ لکھا جا رہا ہے اگر اس میں ''بدنیتی'' شامل نہ ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں کہ نظریات میں اختلاف بھی ہوتا ہے مگر وہ مخالفت جو کسی کو نقصان پہنچانے کے لئے کی جاتی ہے کمینگی کے مترادف ہے اور میرے ساتھ یہی کچھ ہوا ہے۔ افسوس کہ کراچی کے جس نام نہاد پندرہ روزہ ادبی اخبار نے باضابطہ نیت باندھ کر میرے خلاف یہ سلسلہ شروع کیا ہے اس کے مشیروں میں میرے بعض دوستوں کے نام بھی شامل ہیں اور وہ ہیں پروفیسر آفاق صدیقی، پروفیسر نظیر صدیقی اور پروفیسر علی حیدر ملک یہ اور بات کہ ان احباب نے اپنے نام سے کچھ نہیں لکھا مگر اپنے اخبار کی کسی تحریر کی تردید یا اس اخبار سے لاتعلقی کا اظہار بھی نہیں کیا۔''

کہتے ہیں کہ عشق اور جنگ میں سب کچھ جائز ہوتا ہے۔ بدنیتی اور کمینگی جیسے الفاظ اس قسم کی مخالفانہ جنگ میں کیا درجہ رکھتے ہیں یہ حمایت صاحب اور ان کے مخالف جانیں مجھے تو انہوں نے اپنا دوست لکھا ہے۔ جی ہاں میری اور ان کی دوستی ۱۹۵۳ء سے ہے اور بدستور رہے گی اس دوستی کے ثبوت میں میری کئی تحریریں بھی ہیں اور حمایت علی صاحب کو یہ احساس بھی ہے کہ میں نے کبھی ان

کی مخالفت میں نہیں لکھا۔

پچھلے سال ہمارے دوست قیصر سلیم اور جاوید وارثی نے ''بساطِ ادب'' کا اجراء کیا تھا جس کے اعزازی مشیروں میں میرا نام بھی شامل کرلیا تھا۔ ایک دو مرتبہ میٹنگ بھی ہوئی مگر ابتدائی دور میں جب کہ کوئی ایسی تحریر اس اخبار کی زینت نہ بنی تھی جو ذاتی طور پر مجھے قابلِ اعتراض نظر آتی۔ کچھ شماروں کے بعد احمد نوید' دنیائے ادب کے مدیر اوج کمال اور رعنا اقبال کے حوالے سے جب خبروں اور مراسلوں وغیرہ کا سلسلہ شروع ہوا تو حمایت صاحب کو یاد ہوگا کہ انہوں نے فون کر کے مجھ سے شکایت کی۔ اتفاق کی بات کہ اس وقت جاوید وارثی میرے پاس آئے ہوئے تھے۔ میں نے حمایت صاحب اور ان کی بات کرادی۔ جو بہت دیر تک جاری رہی اگر میں بدنیتی اور کمینگی کا مرتکب ہونا تو جلتی پر تیل چھڑکنا موزوں ہوتا۔ صلح صفائی کرانے کی کیا ضرورت تھی؟ جاوید وارثی نے مجھے بتایا تھا کہ حمایت صاحب کا لہجہ بہت سخت اور مرعوب کن تھا۔ نتیجہ ظاہر ہے یہ بھی جوش میں آگئے اور بعد کے شمارے میں بدمزگی کے مزید پہلو نمایاں ہوئے۔ میں نے حمایت صاحب کو یقین دلایا تھا کہ مشاورت سے اپنا نام الگ کررہا ہوں اور یہ یقین دہانی آرٹس کونسل کے ایک بڑے جلسے کے اختتام پر کرائی گئی۔ یہی نہیں بلکہ میں نے عملی طور پر ہر ممکن کوشش کی کہ ایک دوسرے کے دامن کو حریفانہ کھینچنے سے گریز کیا جائے۔ جاوید وارثی صاحب اور حزب اختلاف کے کچھ دوسرے ارکان بھی موجود تھے لیکن ہوا یہ کہ مخالفت کی خلیج بڑھتی گئی۔

آگے چل کر ''بساطِ ادب'' کی اشاعت ہی رک گئی۔ کیونکہ قیصر سلیم صاحب امریکہ چلے گئے۔ جو کچھ ''بساطِ ادب'' میں شائع ہوا تھا اس سے کہیں زیادہ کئی دوسرے انگریزی اور اردو جریدوں میں آنے لگا اور برابر آرہا ہے جیسا کہ اس خط سے بھی واضح ہے۔

میرا بھائی حمایت سے کوئی جھگڑا ٹنٹا نہیں ہے اگر فکری و نظری طور پر کوئی بنائے مخالفت ہوتی تو مجھے ڈھکے چھپے انداز میں مخالفت کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ میں تو اپنے بدترین دشمنوں کو بھی ان کے حال پر چھوڑ دیتا ہوں دوستی کا دم بھرنے والوں پر اوچھے وار کیسے کرسکتا ہوں۔

شاعر کی حمایت نہیں......

ڈاکٹر صابر آفاقی

(مظفر آباد۔ آزاد کشمیر)۔ جون ۹۹ء

افکار کا شمارہ اپریل فردوس دیدۂ و دل بنا اور میں نے اس سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ قدیم عہد میں سرزمین دکن نے درجنوں شعراء پیدا کئے ہیں۔ جنہوں نے داستانوں کو نظم کر کے مقبولیت پائی۔

فرزند دکن جناب حمایت علی شاعر نے اسی روایت کو آگے بڑھایا اور اپنی سوانح اور معاصر تاریخ کے سانحات کو نظم کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ اس طرح اردو شاعری میں موضوع کے اعتبار سے ایک نئی روایت کا آغاز ہوا۔

جناب حمایت علی شاعر شاعر ہی نہیں استاد محقق اور ماہر لسانیات بھی ہیں۔ لیکن انہوں نے ''زمینیں'' کے لئے ''زمینات'' لکھا ہے (ملاحظہ ہو شمارہ اپریل صفحہ ۲۰ حاشیہ) یہ لفظ دیکھ کر میرا ذہن ان بے سواد حضرات کی طرف منتقل ہو گیا جو زبان کی جمع زبانات اور بوری کی جمع بوریات استعمال کرتے ہیں جناب حمایت علی شاعر سے ایسی ادبی لغزش کی توقع نہ تھی۔ چنانچہ ایک قطعہ ان کی نذر کرتا ہوں جو میں نے فی البدیہہ کہا ہے مقصود کسی کی اہانت نہیں بلکہ اصلاح سخن میں اعانت کرنا ہے۔

شاعر کی حمایت نہیں بے جا اچھی
کہتا ہوں زمینوں کو زمینات نہ لکھیں
جو موردِ تنقید ہوں وہ لفظ نہ برتیں
جو باعثِ تنقیص ہو وہ بات نہ لکھیں
جب اہلِ زبان بولتے لکھتے ہیں ''زبانیں''
پھر اہلِ ادب آپ ''زبانات'' نہ لکھیں

حمایت علی شاعر کی تین ہزار سے زائد اشعار پر مشتمل یہ منظوم خودنوشت سوانح حیات ''آئینہ در آئینہ'' ماہنامہ افکار کراچی میں اگست ۱۹۹۵ء سے ستمبر ۱۹۹۹ء تک..... قسط وار چھپتی رہی ہے اس دوران افکار اور دوسرے رسائل میں مختلف اہل ادب' ناقدین اور قارئین کرام کے خطوط بھی اشائع ہوتے رہے۔ جن میں اس نظم پر پسندیدگی کا بھی اظہار ہوتا رہا اور بعض پہلوؤں سے اختلاف بھی..... اختلاف کی جو وجہ نمایاں ہوئی وہ آپ پڑھ چکے ہیں جن حضرات نے حمایت ماجد سے اتفاق کیا اور ان کی اس تخلیقی کاوش کو قدر کی نگاہ سے دیکھا..... ان کے منتخب تاثرات قابلِ مطالعہ ہیں۔

دو باتیں (صابر و آفاق سے)

حمایت علی شاعر (اورنگ آباد دکن)۔ جولائی ۹۹ء

بھائی نکہت..... سلام محبت..... صہبا صاحب کیسے ہیں۔ ان کے بارے میں تمہاری کتاب جس نے دیکھی' تمہاری توصیف کی..... تم نے بڑا کام کیا ہے اب ان کے نام مشاہیر کے خطوط بھی

چھاپ دو اور افکار میں شائع شدہ وہ تمام Bio Datas بھی جو تم نے مرتب کر رکھے ہیں (تم نے تو اس سلسلے میں مزید کام بھی کیا ہے مگر میرے بھائی اپنا مجموعہ کلام بھی شائع کر دو..... ''حرفِ زیرلب'' کیا اچھا نام سوچا ہے۔ تمہاری شخصیت کا بھی آئینہ دار ہے اور تمہاری غزل کا بھی (ہاں تمہارا خط مل گیا تھا)

اچھا میری بات سنو۔ میں دو سوا دو مہینے سے ہندوستان میں ہوں۔ ۲/ اپریل کو دہلی میں ''پاک ہندوستی'' کے سلسلے میں ایک بڑا مشاعرہ تھا۔ اس میں ہندوستان کے بھی اہم شاعر شریک تھے۔ پاکستان سے احمد فراز، کشور ناہید، فہمیدہ ریاض، ثمینہ راجہ اور مجھے بلایا گیا تھا۔ فراز کسی وجہ سے پہنچ نہیں سکے۔ مشاعرہ خوب ہوا۔ ہماری تینوں شاعرات نے بہت اچھی نظمیں سنائیں۔ خوب داد سمیٹی۔ اس مشاعرے کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ آدھا مشاعرہ ہندوستانی شاعر حضرت سردار علی جعفری کی صدارت میں ہوا اور آدھا پاکستانی شاعر..... یعنی میری صدارت میں (باہم دوستی کی خاطر) مظفر نگر اور دوسرے شہروں میں بھی ایسے مشاعرے ہوئے۔ لوگوں نے ساری ساری رات بیٹھ کر اپنے من پسند شعراء کو سنا۔

شمالی ہند میں دو ہفتے گزار کر میں اپنے آبائی شہر اورنگ آباد (دکن) آ گیا۔ یہاں بھی مراٹھی ہندی اور اردو شعراء کے اشتراک سے محفلیں جمیں۔ چند محفلوں میں عالمی پس منظر میں اردو کے نئے مسائل اور امکانات پر میں نے تقاریر بھی کیں۔

اورنگ آباد سے مراٹھی اور انگریزی کے علاوہ اردو کے تین یا چار اخبارات نکلتے ہیں۔ اورنگ آباد ٹائمز، عالمگیر اور رہبر وغیرہ۔ میرے دوران قیام ایک نئے اردو اخبار ''مقدس'' کا اجراء ہوا۔ اس کا افتتاح سابق وزیر اعظم ہند دیوی گوڑا کے ہاتھوں ہوا۔ جو اس مقصد کے لئے کرناٹک سے آئے تھے۔ مہمان خصوصی کے طور پر مجھے مدعو کیا گیا تھا۔ اس محفل میں بھی میں نے اردو اور اورنگ آباد کے تعلق سے مختصر تقریر کی۔

ہر محفل میں اہل ادب نے ''پاک ہند دوستی'' کے جذبے کو سراہا اور اسے پروان چڑھانے کی آرزو کی۔ دیکھئے اہلِ سیاست کیا کرتے ہیں۔

دہلی میں ملک زادہ منظور بھی ملے۔ ان کو خود نوشت ''رقصِ شرر کے عنوان سے'' بیسویں صدی دہلی میں قسط وار چھپ رہی ہے۔ امریکہ اور کینیڈا میں وہ ہمارے ہم سفر تھے۔ ان کا بیٹا ملک زادہ جاوید بھی خوب شاعری کر رہا ہے۔

افکار کا تازہ شمارہ مجھے آج ہی ملا۔ اس میں قسط نمبر ۴۷ چھپی ہے۔ جو میں نے یہاں سے فیکس (Fax) کی تھی۔ محفل کے خطوط میں واصل عثمانی صاحب نے فروری کے شمارے میں کچھ

غلطیوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ کتابت میں کچھ لفظ چھوٹ گئے تو مصرعے بے وزن ہو گئے۔ وہ خود شاعر ہیں اس لئے اپنے طور پر درست پڑھ لیے ہوں گے۔ ہاں ایک اعتراض غور طلب ہے وہ دور کرنا چاہتا ہوں۔ لفظ ''خدا'' شاعری میں کئی معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ انہوں نے ''اللہ تعالیٰ'' سمجھ لیا ایسا نہیں ہے یہاں ''صاحب اختیار'' سے مراد ہے۔

تازہ شمارے میں بھی کچھ کتابت اور کچھ میری کوتاہی کے سبب چند مصرعے توجہ طلب ہیں۔ براہِ کرم قارئین ترمیم و تبدیل فرمالیں۔

صفحہ ۱۶ پر دسواں مصرعہ۔ سفید خون بھی دیکھا دلوں کی کالک بھی۔

اسی صفحہ پر اٹھارہواں مصرعہ۔ مگر ہوں شیعہ تو ان کو ملی ہوئی تھی نجات۔

صفحہ ۱۹ پر پہلا مصرعہ۔ ہر اک برس رمضان میں زکاۃ کٹنا فرض۔

اسی صفحے پر پانچواں مصرعہ۔ صفات و ذات بدلنے لگے خلف نامے۔

اسی صفحے پر چھٹا شعر یوں کر دیجئے۔

جو دفتروں میں ادا اک نماز ہوتی تھی
وہ اک ''سیاست'' اہلِ نیاز ہوتی تھی

صفحہ ۲۰ پر سولہواں مصرعہ۔ اسی بساطِ سیاست پہ ایک نرد ہوں میں، اور اسی صفحے پر حاشیے میں بھی ترمیم فرمالیں۔

''یہ نعتیہ نظم میں نے عہدِ ضیاء میں لکھی تھی جو مئی ۱۹۷۹ء میں ''ماہِ نو'' (لاہور) میں ''محاسبہ'' کے عنوان سے شائع ہوئی تھی اور میرے مجموعہ کلام ''ہارون کی آواز'' (مطبوعہ ۸۵ء) میں ''اعتراف'' کے عنوان سے شامل ہے اس مجموعے کو اکادمی ادبیات پاکستان نے ''علامہ ڈاکٹر محمد اقبال ایوارڈ'' سے نوازا جو پاکستان کا سب سے بڑا ادبی انعام ہے۔ البتہ اس کا اعلان ۱۹۹۱ء میں کیا گیا اور صدر پاکستان سردار فاروق احمد خان لغاری نے ۹۳ء میں ایوارڈ تقسیم کئے۔

محفل میں برادر عزیز ڈاکٹر صابر آفاقی نے ''زمین'' کی جمع ''زمینات'' پر اعتراض کرتے ہوئے ''اصلاحِ سخن میں اعانت'' کے طور پر ایک دلچسپ قطعہ لکھا ہے مگر اتفاق سے وہ خود غلطی کر بیٹھے۔ پہلا مصرعہ رباعی کی بحر ہزج میں ہے یعنی..... مفعول، مفاعیل، مفاعیل، فعل.....

شاعر کی حمایت نہیں بے جا اچھی

باقی مصرعوں میں ایک رکن زیادہ ہو گیا

کہتا ہوں زمینوں کو زمینات نہ لکھیں
مفعول، مفاعیل، مفاعیل، فعولن

ظاہر ہے کہ یہ رباعی کی بحر نہیں ہے انہوں نے بھی اسے ''قطعہ'' لکھا ہے جو ذوالبحرین ہے میں اصلاحِ سخن مین اعانت کی خاطر اسے ایک بحر میں لکھے دیتا ہوں (رباعی کی بحر میں)

شاعر کی حمایت نہیں بے جا اچھی
کہتا ہوں زمینوں کو زمینات نہ لکھ
جو موردِ تنقید نہ ہوں لفظ..... برت
جو باعثِ تنقیص ہو وہ بات نہ لکھ
جب اہلِ زباں خود بھی ''زبانیں'' لکھیں
پھر تو بھی زبانوں کو ''زباناتؔ'' نہ لکھ

ڈاکٹر صابر آفاقی جانتے ہیں کہ میرا تعلق حیدرآباد دکن سے ہے جہاں کی سرکاری اور تعلیمی زبان اردو تھی وہاں زمین کی جمع زمینات لکھا جاتا تھا مگر زبان کو ''زباناتؔ'' کبھی نہیں لکھا گیا۔

اردو میں مختلف زبانوں کے الفاظ شامل ہیں۔ جمع بنانے کا یہ طریقہ ''عربی'' ہے مثلاً بیان کی جمع ''بیانات'' فارسی میں یہ طریقہ نہیں ہے مگر فارسی کے اکثر الفاظ کے ساتھ یہ برتاؤ ہوا ہے مثلاً ''پیغام'' کی جمع ''پیغامات'' ''نگارش'' کی جمع ''نگارشات'' کوئی عجب نہیں کہ ''زبان'' کی جمع ''زباناتؔ'' یہاں رائج ہو جائے ہمیں غیر ضروری طور پر کسی زبان کا تابع نہیں ہونا چاہئے ورنہ خمیازہ کے معنیٰ انگڑائی لکھنا پڑے گا اور حلیہ کو سب لوگ حِلیہ کہتے پھریں گے۔

آخر میں اپنے دوست پروفیسر آفاق صدیقی کے بارے میں عرض کروں کہ میں ان سے بدگمان نہیں ہوں۔ شکایت ان کے رسالے سے رہی۔ اس میں جو کچھ چھپتا رہا سب کے سامنے ہے اور ان کا نام اس وقت تک اس کے مشیروں میں شامل رہا جب تک رسالہ بند نہ ہو گیا۔ میرا ایک لفظ انہیں بہت ناگوار گزرا۔ جو ظاہر ہے کہ ان کے لئے نہیں تھا۔ یہ لفظ ان حضرات کے لئے ہے۔ جو میرا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ تو میرے بیٹے کو نقصان پہنچانے پر تل گئے۔ یہ بات خود آدمی کے کردار کا آئینہ دکھاتی ہے۔ میں تو غالب کا یہ شعر پڑھ کر پہلے بھی خاموش ہوتا رہا ہوں

حسد سزائے کمالِ سخن ہے کیا کیجئے
ستم بہائے متاعِ ہنر ہے کیا کہیے

اور جیسا کہ نئی نسل کے حوالے سے میں نے اپنی طویل نظم ''حرف حرف روشنی'' میں کہا ہے..... اوج کمال کو بھی یہی نصیحت کرتا ہوں۔

تمہیں زمین پر رہنا ہے آسماں کی طرح
سمیٹنا ہے ہر اک غم کو اپنے دامن میں

کشادہ ظرفی قلبِ پیمبراں کی طرح

چنانچہ اس نے بڑی قوتِ برداشت سے کام لیا "دنیائے ادب" کے صفحات شاہد ہیں۔ بھائی ضیاء صاحب نے جو مشورہ دیا ہے وہ بہت خوب ہے حاصلِ کلام تو یہی ہے کہ...... کچھ لوگ پہچانے گئے...... غالب نے کہا تھا......

سایہ شاخِ گل، افعی نظر آتا ہے مجھے

کچھ یہی عالم میرا بھی ہے...........

دوستی کے نام سے ہی اب لرزجاتا ہے دل

پاکستان آکر میں انشاءاللہ جولائی میں جرمنی چلا جاؤں گا۔

شاعر کو سلام

احمد رئیس (کراچی)۔ اگست ۹۸ء

محترم صہبا صاحب تسلیم و نیاز۔ آپ کی خیریت افکار کی وساطت سے معلوم ہوتی رہتی ہے پرچہ موصول ہوتا ہے تو آپ کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔ یہ ایک بڑا چمتکار ہے کہ افکار بہ فخر وشان ظہور پذیر ہورہا ہے اور آپ کے پائے ثبات میں کہیں لمحہ ٹھہراؤ یا لغزش کا احساس نہیں ہوا۔ تازہ شمارہ بابت جون ۹۹ء بھی اپنی دیرینہ روایت اور قابل قدر تحریروں سے مزین ہے۔ آج گفتگو میں حمایت علی شاعر کے حوالے سے کرنا چاہتا ہوں بالخصوص ان کی منظوم سوانحی داستان کے حوالے سے اظہار خیال کررہا ہوں۔ چونکہ نظم افکار میں مسلسل شائع ہورہی ہے تو شاعر اور نظم کے حوالے سے بات افکار ہی میں ہونی چاہیئے۔

شاعر کو سلام کررہا ہوں
لفظوں کی عظیم سلطنت کے
تابندہ جبین تاجور سے
منسوب یہ شام کررہا ہوں
شاعر کو سلام کررہا ہوں

یہ شخص ہے شاعروں میں یکتا
اس عہد کے ساحروں میں یکتا
یعنی کہ ہے دلبروں میں یکتا
اس سچ کو میں عام کررہا ہوں

شاعر کو سلام کررہا ہوں

لکھی ہے جو اس نے آپ بیتی
لگتی ہے وہ داستان سب کی
ہے اپنی زمین اس میں بستی
یوں اس سے کلام کررہا ہوں
شاعر کو سلام کررہا ہوں

افکار کا ہے یہ کارنامہ
ہے خوب رواں دواں یہ خامہ
کھلتا ہی چلا گیا ہے جامہ
پابند مقام کررہا ہوں
شاعر کو سلام کررہا ہوں

شہرہ ہے تو شاعر دکن کا
قائل ہے ہر ایک اس کے فن کا
ہے فرد یہ اپنی انجمن کا
دل اس کے ہی نام کررہا ہوں
شاعر کو سلام کررہا ہوں

بے بات خفا ہیں لوگ اس سے
بیکار بڑھا رہے ہیں جھگڑے
اپنی ہی صدی کے ہیں یہ قصے
تاریخ کے نام کررہا ہوں
شاعر کو سلام کررہا ہوں

محسن ہے یہ نسل تازہ دم کا
ساتھی ہے یہ اپنے ہم قدم کا
اک خواب ہے یہ ہر اک صنم کا

میں ماہ تمام کر رہا ہوں
شاعر کو سلام کر رہا ہوں

حمایت کی حمایت

ستیہ پال (آٹووا۔کینیڈا)۔دسمبر ۹۸ء

افکار کے تین شمارے یکے بعد دیگرے موصول ہوئے۔ مجھے حمایت علی شاعر صاحب کی خودنوشت شعری سوانح حیات کے سقوط ڈھاکہ کے حوالے سے دو یا تین اشعار کے بارے میں کچھ احباب کے اعتراضات پڑھ کر کچھ اچھا نہیں لگا۔ تاریخ سطحی طور پر صرف اعداد و شمار، نام ونسب نصرت وشکست، تخت نشینی اور تختہ دار پر چڑھنے کی تاریخوں کا نام ہی نہیں ہے۔ تاریخ ایک جائزہ بھی ہے اور جائزے کے لئے تاریخی شعور کے علاوہ نقطہ نظر کی ایک عینک بھی ضروری ہے۔ یہ دونوں اشیاء شاعر صاحب کے ہاں موجود ہیں۔ غیر پاکستانی ہونے کی حیثیت سے مجھے شاید یہ حق نہیں پہنچتا کہ میں اس مسئلے پر رائے زنی کروں لیکن سقوط ڈھاکہ کے بارے میں ایک درجن کے لگ بھگ کتابیں پڑھنے کے بعد میں بصد عجز وانکسار یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ بازبینی کے عمل میں وہ درجنوں اکابرین جن کا تعلق اندرون پاکستان اور بیرون پاکستان باشعور طبقے سے ہے۔ حمایت علی شاعر صاحب کے ہی ہم خیال ہیں۔ تاریخ کا تجزیہ کسی بھی مورخ کو قابل گردن زدنی قرار نہیں دیتا۔ مجموعی طور پر موصوف کی خودنوشت سرگذشت ایک ''شعری تاریخی دستاویز'' ہے جس میں شعری محاسن تو ہیں ہی لیکن خودنوشت سوانح عمریوں کے گناہ کبیرہ یعنی .... Self Aggrandisement سے پرہیز کیا گیا ہے۔

اہلِ نظر کے تاثرات

(ماخوذ ''افکار'')

محمد احمد سبزواری (کراچی)۔ستمبر ۱۹۹۵

اب آپ نے منظوم سوانح کا آغاز میرے ایک قدیم دوست مسلم ضیائی کے چہیتے اور اب میرے بھی چہیتے حمایت علی شاعر سے کردیا ہے۔ ان کی پہلی قسط مجھے خاص طور پر اس لئے بھی دلچسپ لگی کہ ۳۳۔۳۵ سال کا زمانہ میں نے بھی اورنگ آباد میں گزارا' وہیں سے انٹر کیا اور دو سال کالج کے دوماہی رسالے نورس کا مدیر بھی رہا۔ لہٰذا آج ساٹھ سال بعد وہ سارا منظر ایک فلم کی

طرح نظروں کے سامنے منعکس ہوگیا۔ منظوم سوانح ایک دشوار اور کٹھن کام ہے کیونکہ اس میں تاریخی حقائق کو بھی سامنے رکھنا پڑتا ہے تاہم مجھے حمایت کی صلاحیت اور ذہانت اور انج پر پورا بھروسہ ہے کہ وہ اس منزل سے سرخرو نکلیں گے۔

اکرام بریلوی (کینیڈا)۔ اکتوبر ۱۹۹۵ء

اگست کے پرچے میں حمایت علی شاعر کی منظوم سوانحی خودنوشت پسند آئی۔ ابتداء ہی اتنی جاندار ہے تو انتہا کیا ہوگی۔ ان کی شاعرانہ صلاحیتوں میں تاریخی، ثقافتی اور علمی تبحر ابتداء ہی سے اپنا سکہ جمائے نظر آرہے ہیں۔ ہمیں یقین واثق ہے کہ وہ آگے چل کر بھی اسے قائم رکھیں گے۔

محمد خالد اختر (کراچی)۔ نومبر ۱۹۹۳ء

حمایت علی شاعر کی منظوم خودنوشت آئینہ در آئینہ خوب جارہی ہے۔ حمایت برسوں کی مشق سخن سے بطریق احسن کام لے رہے ہیں۔ اورنگ آباد اور دکن کی زمردیں سرزمین کے نقش ونگار اپنے اسلاف کے اوصاف ومشغولات جس خوبی سے وہ ہمارے سامنے لائے ہیں میں اسے اعجاز کہوں گا۔ شاعری کے بارے میں، میں کچھ نہیں جانتا مگر حمایت کے جگمگاتے اشعار مجھے بہت اچھے لگے اگر وہ اس کو یتا کو اسی حسن طبع، اسی خوش آہنگی، اسی وجدانیت سے چلاتے رہے تو ہمارے ادب میں ایک انوکھی اور منفرد چیز آجائے گی۔ ہاں یہ بتاؤ کیا پہلے کسی شاعر نے منظوم آپ بیتی لکھنے کا تجربہ کیا ہے؟

(نہیں یہ پہلی منظوم خودنوشت ہے۔ صہبا لکھنوی)

آفاق صدیقی (کراچی)۔ مارچ ۱۹۹۶ء

برادرم حمایت علی شاعر کی منظوم خودنوشت کی چند قسطیں شائع ہوچکی ہیں جن کو پڑھ کر نہ صرف یہ کہ ایک صفِ اول کے شاعر کی زندگی کا عکس ہمارے سامنے منظوم کیفیات کے ساتھ آتا ہے بلکہ یہ احساس بھی جاگا کہ اگر شعر کہنے کا اچھا شعور وادراک ہو تو خودنوشت کے تلخ وترش حقائق کو بھی بڑی جامعیت کے ساتھ شاعری کے پیکر میں ڈھالا جاسکتا ہے۔ اس منظوم خودنوشت میں "بنگال سے کوریا تک" والی شاہکار نظم کا رنگ وآہنگ ملتا ہے۔ میری جانب سے آپ اور آپ کے معاونین لائق تحسین ہیں اور برادرم حمایت علی شاعر کو بھی اپنے دل کی گہرائیوں سے پیشگی مبارکباد دیتا ہوں کہ یہ یادگار کارنامہ بخیر وخوبی پایہ تکمیل کو پہنچے۔

پروفیسر ضیاء (کینیڈا)۔اپریل ۱۹۹۶ء

اب تک منظوم افسانہ، ڈرامہ، تاریخ اور نثری سوانح حیات کا ذکر ضرور سنتے چلے آرہے تھے مگر کسی نے اپنی منظوم سوانح عمری لکھی ہو اس کا سراغ نہیں ملتا یا کم از کم میرے علم میں نہیں ہے۔ میرے نزدیک حمایت علی شاعر کی یہ کاوش ہمارے ادب میں ایک اہم اور گراں قدر اضافہ ہے۔ انہوں نے اردو زبان کو جو اپنی تخلیقات اور نگارشات سے مالا مال کیا اس پر تو ہم سب کو شکر گزار ہونا چاہئے اور جو نوادر انہوں نے ہم سب کے دامن میں بکھیرے ہیں اس کا اعتراف بھی لازم ہے۔ مگر جو قابلِ قدر اضافے کئے ہیں مثلاً ثلاثیاں..... ان کا ذکر ہماری ادبی تاریخ کا حصہ بن جائے گا۔اب منظوم خودنوشت کی جو طرح ڈالی ہے وہ بھی اپنی جگہ بے مثال اور لازول ہے اور اس جدت کا سہرا بھی انہیں کے سر بندھتا ہے۔ جس محنت، لگن، جگر کاوی اور رنگ و آہنگ کے ساتھ وہ اپنی زندگی کے معمولی اور غیر معمولی واقعات، سانحات اور تجربات ہماری نظروں کے سامنے لا رہے ہیں، اس کی داد میں تو دل کی گہرائیوں سے دوں گا۔ مگر دوسروں کے لئے بھی یہ توجہ کا مرکز بننا چاہئے۔

خصوصیت سے جب اس سوانح میں تاریخ کی اہم معلومات شواہد اور اسناد کے ساتھ بھی موجود ہوں اور اس کے عہد کی معاشرتی، تہذیبی اور سیاسی جھلکیاں بھی بطورِ خاص نمایاں ہوں۔ میں بذاتِ خود تاریخ کا ایک معمولی اور ادنیٰ ترین طالب علم ہوں اور تاریخ سے میری دلچسپی کا علم مرے احباب اور واقف کاروں کو بخوبی ہے۔ مجھے تو تاریخ اور نگ آباد کے اوراق اس خودنوشت میں بکھرے ہوئے نظر آئے اس پر میری نگاہیں جم کر رہ گئیں۔ میں خود اورنگ آباد خلد آباد، اجنتا، ایلورہ وغیرہ ہو کر آیا ہوں لہٰذا اس علاقے سے اچھی طرح واقف ہوں اب اور زیادہ واقف ہو گیا ہوں۔ اس اعتبار سے مجھے حمایت کی منظوم داستانِ حیات کے علاوہ جہاں تک سماجی اور ثقافتی روایات اور رجحانات کا تعلق ہے اور ظلِ الٰہی کے بت کو جس طرح انہوں نے پاش پاش کیا وہ لائق توجہ ہے۔ ان کی خودنوشت پڑھ کر ظلِ الٰہی کے پرستاروں، خدمت گزاروں پر کیا گزرے گی اس کے بارے میں سوچ کر مزہ آنے لگا ہے۔ ان کا یہ اجتہاد اور غیر عقیدت مندانہ رویہ اہلِ فکر و نظر کے لئے ایک ''لمحہ فکریہ'' مہیا کرتا ہے یہ بات اس وجہ سے بھی لکھنا ضروری تھی کہ کسی رسالے میں پڑھا تھا کہ پنجاب کے ایک مہمل گو جربزعمِ خویش اپنے کو اقبال اور فیض سے بڑا سمجھتا ہے کراچی کے کسی شاعر کی عظمت کا سرے سے قائل ہی نہیں ہے۔ اس کے برخلاف کیفی اعظمی نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ فیض کے بعد حمایت علی شاعر کو پاکستان کے سب سے بڑے اور ایک منفرد لہجے کا قابلِ

احترام شاعر سمجھتے ہیں اگرچہ یہ بات انہوں نے محاکے کے طور پر کہی تھی مگر کہی ضرور.....

اقبال متین (نظام آباد دکن۔ بھارت)۔اپریل ۱۹۹۶ء

ستمبر کا رسالہ نہ ملنے کی وجہ سے حمایت علی شاعر اور "شورانی" کی تخلیقات کی ایک کڑی ٹوٹ گئی حمایت علی شاعر کی منظوم خودنوشت میں تیسری قسط بڑی دلچسپی سے پڑھی گئی۔ سوانحی خودنوشت لفظ و بیان اور اظہار کی شگفتگی کو اپنے ساتھ نہ رکھے تو بوریت کا خدشہ لگا رہتا ہے۔ اس صنف کے لئے نثر کا بانکپن بھی ضروری ہے۔ اگر نثر میں جھول ہو تو زندگی کے کچھ ڈرامائی واقعات یا حادثات نثر کو سہارا تو دے لیتے ہیں لیکن ایسے واقعات کا وقوع پذیر ہونا کوئی ضروری نہیں ہے۔ حمایت علی شاعر نے منظوم سوانح کا آغاز کر کے اپنے ہی فن کی صلاحیت کو امتحان میں ڈال لیا ہے لیکن ان کا تخلیقی اوج بڑے سلیقے سے شگوفے کھلا رہا ہے۔

نور بجنوری (اسلام آباد)۔مئی ۱۹۹۶ء

حمایت علی شاعر کی منظوم سوانح حیات خاصے کی چیز ہے۔ اس کی انفرادیت اور طرز بیان.....اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

طاہر نقوی (کراچی)۔مئی ۹۶ء

منظوم خودنوشت فنی اعتبار سے دشوار ضرور ہو سکتی ہے مگر میرے نزدیک زندگی کی جزئیات اور اہم موڑ نظم کے پیرائے میں اس طرح موثر انداز میں بیان نہیں کئے جا سکتے۔ چنانچہ حمایت علی شاعر نے ضرورتِ شعری کے تحت کئی واقعات کو یا تو رہنے دیا ہوگا یا ویسے ہی بیان نہیں کیا ہوگا جیسے وہ پیش آئے ہوں گے۔ تاہم ان کی منظوم خودنوشت کی اہمیت سے انکار نہیں۔

جمیل ملک (راولپنڈی)۔جون ۹۶ء

حمایت علی شاعر سے دیرینہ قلمی قربت ان کی منظوم سوانح حیات پڑھ کر ایک ذہنی قربت کا بھی اضافہ کر رہی ہے جس سے لطف دوبالا ہو رہا ہے۔

محسن احسان (پشاور)۔جون ۹۶ء

"آئینہ در آئینہ" حمایت علی شاعر کی منظوم سوانح حیات دلچسپ بھی ہے اور حیدرآباد دکن کی تہذیب و ثقافت کی آئینہ دار بھی اس میں تازگی فکر بھی ہے اور شگفتگی اظہار بھی۔

علی امام (لاہور)۔ جون ۹۶ء

اب آپ نے ایک اور کمال کر دکھایا کہ منظوم خودنوشت شروع کرادی۔ آپ نے حمایت علی شاعر کو اس کے لئے منتخب کیا۔ یہ آپ کے دیرینہ تجربے اور جہاں دیدگی کا کرشمہ ہے۔ یہ کام کراچی میں شاید کوئی دوسرا شاعر نہیں کر سکتا تھا اگر کوئی کرتا بھی تو اس طرح لطف سخن پیدا کرنے میں کامیابی مشکل تھی۔ بہرحال لطف آ رہا ہے۔

یوسف ناظم (بمبئی)۔ جولائی ۹۶ء

حمایت علی شاعر کی منظوم خودنوشت کے بارے میں طاہر نقوی کا مکتوب بھی پڑھا۔ میں اسے نقطہ نظر تو نہیں کہتا لیکن ہماری اردو نظم میں بڑی طاقت ہے اور کوئی بھی مثنوی، مرثیہ (کسی بھی نقطہ نظر سے پڑھا جائے) نامکمل نظر نہیں آتا اور پھر کیا ضروری ہے کہ نثر میں مصنف ساری باتیں ہی بیان کر دے (میں مثالیں کیوں دوں)۔

پروفیسر ساجدہ زیدی (علی گڑھ)۔ جولائی ۹۶ء

حمایت علی شاعر کی منظوم خودنوشت معرکے کی چیز ہے۔

نقاش کاظمی (کراچی)۔ جولائی ۹۶ء

محترم حمایت علی شاعر (حمایت بھائی) کی منظوم خودنوشت منظوم تاریخ دکن سے کسی طور پر کم نہ ہوگی اور جس نئے انداز کا یہ کام ہے ادب میں تاریخی نوعیت کے اعتبار سے دیکھا جائے گا۔

ڈاکٹر ستیہ پال آنند (امریکہ)۔ اکتوبر ۹۶ء

محترم بھائی حمایت علی شاعر کی خودنوشت سوانح حیات خوب سے خوب تر ہوتی جا رہی ہے۔ زیر نظر قسط (۱۱) ماضی قریب کی کچھ گرہیں کھولتی ہے۔ جہاں ایک طرف مخدوم محی الدین کے حوالے سے تحریک تلنگانہ کا ذکر ہے وہاں دوسری طرف شاہ دکن میر عثمان علی خان اور ان کی افواج کے کمانڈر انچیف کے ہندوستان کے چیف آف دی اسٹاف سے خفیہ معاہدہ کی طرف بھی صاف اشارہ ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ کسانوں کی خود کاشت زمینوں پر قبضے، چوپالیں اور پنچایتیں قائم کرنے کے بعد تلنگانے میں ایک متوازی سرکار کا قیام اور اس کی کارکردگی جو بھارتی ''پولیس ایکشن'' کے وقت اپنے عروج پر تھی انڈیا کے پہلے وزیر داخلہ سردار پٹیل کے احکام پر بیدردی سے کچل دی گئی کرشن چندر کا ناول ''جب کھیت جاگے'' (کچھ خامیوں کے باوجود) اس تحریک کی معتبر

افسانوی دستاویز ہے۔ جہاں صدیق جائسی کی کتاب ''دربار در بار'' ولی عہد دکن کے دربار کی چمک دمک اور غلاظت کے راز ہائے درون سے پردہ اٹھاتی ہے بلکہ جناب قاسم رضوی کی ذات ان کے خوشامدی حواریوں اور ان کے اردگرد موجود انڈیا کے خفیہ ایجنٹوں اور ولی عہد دکن کے دربار کو ایک خاص طنزیہ انداز سے پیش کرتی ہے۔ حمایت بھائی کی خوبصورتی یہ ہے کہ تاریخ کے ان ابواب کو کھولتے ہوئے ان پر جمی ہوئی گرد اور غلاظت سے انہوں نے اپنا دامن داغدار نہیں بنایا اور کمال Datached اور غیر جانبدارانہ تاریخی شعور سے ان پیچیدہ اور دشوار گزار راستوں کو طے کر گئے۔ مبارکباد۔

جگن ناتھ آزاد (نئی دہلی)۔ اکتوبر ۹۶ء

حمایت علی شاعر کی نظم ''آئینہ در آئینہ'' بلند سے بلند ہوتی جا رہی ہے۔ اس شمارے میں جو حصہ شائع ہوا ہے اس کے آخر اشعار میں اندازِ بیان نے انتہائی نازک صورت اختیار کی ہے اور یہ ہر شاعر کے بس کی بات نہیں۔

رام لال (لکھنو)۔ اکتوبر ۹۶ء

حمایت علی شاعر کی منظوم خودنوشت سوانح ''آئینہ در آئینہ'' اپنے آپ میں تاریخ کا ایک حصہ تو ہے ہی، ساتھ ساتھ ایک اعلیٰ و معیاری شعری تجربہ بھی ہے۔

خالدہ پروین درانی (دمام)۔ اکتوبر ۹۶ء

حمایت بھائی ابھی حیدر آباد سے نہیں نکلے ہیں۔ وہاں کا جغرافیہ اور تاریخ انہیں آگے بڑھنے کی مہلت ہی نہیں دے رہی ہے۔ ان کی قادر کلامی سے کسے انکار ہو سکتا ہے۔ وہ بنیادی طور پر نظم کے ماہر ہیں اور ان کی طویل نظموں کا کیا کہنا منظوم خودنوشت اس سلیقے سے وہی لکھ سکتے ہیں۔ ان کا مخصوص انداز اسی طمطراق کے ساتھ موجود ہے اور واقعات سپاٹ نہیں شعری حسن و لطافت کے ساتھ موجود ہیں۔ میری نظر میں اس سے پہلے کوئی خودنوشت منظوم پیرائے میں نہیں گزری۔ اس کا بے چینی سے انتظار رہتا ہے۔ یہ جان کر عجیب خوشی ہوئی کہ حمایت بھائی کی ماں کا نام بھی وہی تھا جو ہماری امی جان کا تھا۔ سب نے اخبار میں پڑھا کہ حمایت بھائی کی سترویں سالگرہ کسی ادارے نے بڑی دھوم دھام سے منائی اور اس موقع پر ان کی شخصیت اور فن پر مشتمل ایک ضخیم کتاب بھی شائع ہوئی ہے (مجلّہ شخصیت کا حمایت علی شاعر نمبر ٹیلنٹس گلڈز کراچی نے ۴ جولائی ۱۹۹۶ء کو شائع کیا تھا) یقین نہیں آتا کہ وہ ستر سال کے ہو گئے ہیں۔ دراصل یہ زندگی کو قرینے سے گزارنے کا

ثمرہ ہے اللہ تعالیٰ انہیں لمبی عمر دے اور ہمیشہ صحت مند رکھے۔ آمین

رفعت سروش (دہلی)۔ اکتوبر ۹۶

حمایت علی شاعر "آئینہ در آئینہ" کے لئے مسلسل مبارکباد کے مستحق ہیں۔

اکبر حیدر آبادی (برسٹل۔ برطانیہ)۔ جنوری ۹۷ء

حمایت علی شاعر کی منظوم خودنوشت (خصوصاً میرے لئے) دو طرح کی دلچسپیاں رکھتی ہے۔ ایک یہ کہ منظوم ہے۔ دوسری یہ کہ جن یادوں اور تجربوں پر مشتمل ہے اپنے آپ کو ان کا جزو لاینفک محسوس کرتا ہوں۔ گویا۔

ہم پہ مشترکہ ہیں احسان غم الفت کے

اور پھر حمایت نے بڑی سادگی، روانی اور بے ساختگی سے واقعات کو نظم کیا ہے نہ صرف یہ کہ (باوجود طوالت) ابھی کوئی جھول نظر نہیں آتا، بلکہ طرز بیان کی لطافت اور موزونیت بھی نہایت اثر انگیز ہے۔

ڈاکٹر مظفر الدین فاروقی (شکاگو)۔ جنوری ۹۷ء

حمایت علی شاعر کی منظوم خودنوشت بہت اچھی جارہی ہے۔ موصوف اپنی ذات کے حوالے سے انقلابی ترقی پسند ادب کی تاریخ مرتب کررہے ہیں۔ یہ مکمل ہوگی تو حیدر آباد دکن سے لے کر ارض پاک تک کی پچاس سالہ ادبی تاریخ مرتب ہوجائے گی۔ اس خودنوشت میں بعض مقامات پر نازک موڑ آئے ہیں ایک موڑ قسط (۱۲) کے اختتام اور قسط (۱۳) کے ابتدائی حصے میں آیا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ شاہی نظام سیاست میں جمہوری عوام کا انحصار مزاج شاہی کا تابعدار ہوا کرتا ہے چنانچہ بارے اس دور کے انقلاب ادب "نظام کہن" کے کارندوں کی سانسوں سے اٹھنے والی بوئے کفن کو علامتی اظہار کا فن کارانہ قالب عطا کر کے شہکار ادب تخلیق کیا ہے۔ لیکن یہ کیا کہ آج عہد عوام کے کارندوں کی سانسوں سے بارود کی بو آرہی ہے۔ ان کا لباس فاخرانہ خون میں ڈوبا ہوا ہے اور سارا قامت گورزر میں بے کفن لپٹا ہوا ہے تاکہ کفن والی جگہ زر کے کچھ اور ٹکے سما سکیں۔ اس بوقلمونی پر ارتقاء پذیر ذہن ایک سیکنڈ ٹھہر کر سوچنے پر مجبور ہوجاتا ہے۔ شاید فکر نو کا وقت آچکا ہو، پیمانہ حیات بدلنے کی ضرورت ہو وغیرہ وغیرہ..... خیر اس نامکمل اشارے کی بے وقت راگنی سے قطع نظر مجھے اس اعتراف پر فخر ہے کہ حمایت علی شاعر کا قلم ایک لازوال نظم تخلیق کررہا ہے اور ایسے موڑ شاید اس دور کی عکاسی کے لئے ضروری ہیں جو تاریخ ادب کا حصہ بن جائیں۔

ایس۔ام۔رحمان (ڈیلس۔امریکہ)۔اپریل ۹۷ء

آج حمایت علی شاعر کی منظوم خودنوشت ''آئینہ در آئینہ'' کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ منظوم سوانح کے عنوان سے اب سے پہلے بھی چند شعرا کی نگارشات شائع ہو چکی ہیں۔ مثلاً علی سردار جعفری کی نامکمل سوانح ''نومبر میرا گہوارہ'' (افکار۔ سردار جعفری نمبر) ڈاکٹر وزیر آغا کی ''شام کی منڈیر سے'' (ڈاکٹر صاحب کی منظوم سوانح حیات کا نام ہے ''آدھی صدی کے بعد'') اور شمس الرحمٰن فاروقی کی نامکمل سوانح حیات ''آسماں محراب'' وغیرہ۔

یہ تینوں آزاد نظمیں ہیں اور ان میں بحریں بھی بدلتی ہیں دوسری بات تینوں کا انداز بیان بقول ڈاکٹر مظفر حنفی ''خارج سے کم اور باطن سے زیادہ ہے'' جب کہ زندگی کا تعلق خارجی بھی ہوتا ہے اور باطنی بھی' اور پھر ہر سوانح حیات اپنے دور کا ایک واقعاتی پس منظر بھی رکھتی ہے۔ جس سے اس دور کے انفرادی اور اجتماعی مسائل' اندازِ فکر اور مخصوص تاریخی حالات کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ ایک اچھا سوانح نگار تاریخ کو زندہ حقیقتیں فراہم کر دیتا ہے۔

''مذکورہ نظموں کو ان کے شعراء کی زندگی کے بعض پہلوؤں کا خوبصورت تاثراتی مطالعہ تو کہا جاسکتا ہے۔ سوانح حیات نہیں'' منظوم سوانح حیات بقول آپ کے پہلی بار لکھی جارہی ہے۔ اس میں اپنے مخصوص واقعات کے ساتھ ایک جیتا جاگتا آدمی سانس لے رہا ہے جس کے دنیاوی رشتے بھی ہیں اور نظریاتی حوالے بھی۔ جس کے دکھ سکھ بھی ہیں اور خوشیاں بھی۔ جس کی زندگی تاریخ کے ایک مخصوص دور کی آئینہ دار ہے۔ یہ سوانح اپنے ماحول اور معاشرتی اقدار و مسائل کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہے۔ اس میں سوانح نگار کا رویہ اپنے گرد و پیش کی عکاسی ہی نہیں بلکہ تنقیدی اور تجزیاتی بھی ہے وہ اپنی ذات سے باہر بھی دیکھ رہا ہے اور ذات کے اندر بھی۔ نتیجتاً ''آئینہ در آئینہ'' کا ہر حصہ ایک تاثر بھی چھوڑ جاتا ہے۔ حمایت علی شاعر صاحب چونکہ ڈرامہ نگار بھی ہیں اس لئے تجسس بھی برقرار رکھتے ہیں۔ یہ خصوصیت ان کی ثلاثیوں اور نظموں میں بھی جھلکتی ہے' بقول ڈاکٹر سید عبداللہ..... ''شاعر ایک مفکر اور نکتہ آفرین فن کار ہے'' اور میرا خیال ہے کہ انہیں کہانی لکھنے کا آرٹ بھی آتا ہے۔ ان کی طویل افسانوی نظمیں ''بنگال سے کوریا تک'' اور ''شعلہ بے دود'' وغیرہ اس کی گواہ ہیں سوانح نگاری زندگی کو افسانہ بنانے کا نام ہے اور خودنوشت تو اپنی ''تخلیق نو'' سے عبارت ہے۔ حمایت صاحب نے ایک بہت مشکل کام اپنے ذمہ لیا ہے۔ خدا کرے تکمیل تک پہنچ جائے۔

خالدہ درانی (دمام)۔اپریل ۹۷ء

حمایت علی شاعر صاحب کی خودنوشت سوانح ''آئینہ در آئینہ'' جیسے جیسے آگے بڑھ رہی ہے۔ قاری پر اپنی گرفت سخت کرتی جا رہی ہے۔ وہ اپنے ساتھ اپنے زمانے کو اس کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی صورتحال کو لے کر آگے بڑھتے جا رہے ہیں۔ اس شمارے کی قسط نے تو عجیب سی کیفیت طاری کر دی۔ حیرت ہوتی ہے کہ حمایت صاحب واقعات کو اس خوبی سے بیان کرنے پر قادر ہیں کہ شاعری اپنی جگہ اپنے بھرپور تاثر کے ساتھ قائم رہتی ہے اور یہ کام آسان نہیں، نہ ہر ایک شاعر کے بس کا ہے۔ اس کی ہر قسط پڑھ کر نئی قسط کا انتظار شروع ہو جاتا ہے۔

سید قمر حیدر قمر (جدہ۔سعودی عرب)۔مئی ۹۷ء

''آئینہ در آئینہ'' دلچسپ سے دلچسپ تر ہوتی جا رہی ہے۔ شاعری کا کیا خوبصورت استعمال ہے حمایت بھائی مبارکباد کے مستحق ہیں۔

اکرام بریلوی (کینیڈا)۔جون ۹۷ء

''آئینہ در آئینہ'' بڑے ادبی وقار کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے۔ یادیں ذاتی ہوں کہ تاریخی..... معاشرے اور ماحول کی چہرہ نمائی کرتی ہیں کم از کم تاریخ کا یہی دعویٰ ہے۔

شفیقہ فرحت (بھوپال)۔اکتوبر ۹۷ء

''آئینہ در آئینہ'' بڑی کاوش سے لکھی جانے والی خودنوشت ہے۔ اس کا ہر ماہ بڑی بے چینی سے انتظار رہتا ہے۔

وزیر احمد شان (کراچی)۔نومبر ۹۷ء

حمایت علی شاعر کی خودنوشت سوانح حیات کا ذکر نہ کرنا گویا بددیانتی میں شمار ہوگا۔ ہر قسط تشنگی بڑھاتی ہے اور انتظار کی لذت سے آشنا کرتی ہے۔ خدا انہیں مزید زور قلم عطا کرے۔ آمین۔

مظہر امام (دہلی)۔دسمبر ۹۷ء

حمایت علی شاعر کی منظوم خودنوشت سلیقے سے آگے بڑھ رہی ہے۔ نظم اپنے دور کی ادبی و سیاسی صورتحال کا احاطہ کرنے میں کامیاب ہے۔

سرشار صدیقی (کراچی)۔جنوری ۹۸ء

حمایت علی شاعر کی منظوم سوانح ''آئینہ در آئینہ'' حسب سابق بہت دلچسپ اور معلومات افزا ہے۔

سرفراز تبسم (گوجرانوالہ)۔جنوری ۹۸ء

حمایت علی شاعر کی منظوم خودنوشت اپنے اندر اور بھی گہری ہوتی جارہی ہے۔ میرے نزدیک یہ نوجوان نسل کے لئے ایک حیرت انگیز داستان ہوگی۔

الطاف فاطمہ (لاہور)۔فروری ۹۸ء

حمایت علی شاعر کی منظوم خودنوشت آپ بیتی نہ صرف دلچسپ ہے بلکہ ہمارے گذشتہ پچاس سالہ ادبی دور میں جہاں تک میرا علم ہے منفرد اور بڑے خاصے کی چیز ہے۔ کم از کم میری نظر سے ٹائم اور ٹائڈ کے خطوط پر سلاست بیانی کی حامل منظوم آپ بیتی ابھی تک نہ گزری تھی۔ اس کے بیان کی سلاست، سہل انداز بیان میں اپنی زندگی کے ساتھ زمانے کی رو اور موج کا جوا بیان کرنا ہر ایک کا حصہ اور حوصلہ نہیں۔ مجھے پڑھتے وقت بجز میر صاحب کی مثنوی ''خواب وخیال'' کے اور کسی دوسری آپ بیتی کا خیال آتا ہی نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ''سادہ بیانی'' اور ''سادہ کاری'' آسان کام تو نہیں ہے مگر خدمتِ خلق ضروری ہے کہ ہم جیسوں کی سمجھ اور سوادِ عقل کو ملحوظ خاطر رکھ کر بڑی بڑی باتیں یوں کر جانا کہ پڑھنے والا مرعوب ہوئے بغیر باخبر ہوتا چلا جائے اور لطف اندوز بھی ہو سکے..... اس لطف اندوزی کے لئے آپ کی شکر گزار ہوں۔

ڈاکٹر یونس میر (ڈربن۔جنوبی فریقہ)۔فروری ۹۸ء

حمایت علی شاعر صاحب کی منظوم خودنوشت بھی خوب ہے۔

مشتاق شاد (میرپور۔آزاد کشمیر)۔فروری ۹۸ء

حمایت علی شاعر کی ''آئینہ در آئینہ'' خوبصورتی اور تسلسل سے پڑاؤ پر پڑاؤ منزل کی طرف گامزن ہے۔ یہ نہ صرف منظوم سوانح حیات ہے بلکہ اچھی اور اعلیٰ درجے کی شاعری بھی ہے جس میں سیاسی معاشرتی اور ادبی اقدار بدلتے وقت کے ساتھ رواں دواں ہیں۔ کئی دوستوں سے

ملاقات ہو رہی ہے کئی پرتیں اتر رہی ہیں۔ کئی گنجل پڑ رہے ہیں اور کئی گرہیں کھل رہی ہیں۔

جمیل الدین عالی (کراچی)۔ مارچ ۹۹ء

''افکار'' میں برادر محترم جناب حمایت علی شاعر کی منظوم خودنوشت میں گلڈ شہاب مرحوم ناچیز اور کسی صدارتی ایوارڈ کے حوالے سے جو کہا گیا ہے اس میں ان سے سہو تسامح ہو گیا ہے۔ فی الحال صرف اتنی گزارش بطور خط شائع فرما کر ''افکار'' کے ریکارڈ پر لے آئیں تو ممنون ہوں گا۔ باقی ماہتاب باقی۔

(حمایت علی شاعر کی وضاحت)

ماخوذ اشاریہ ''آئینہ در آئینہ'' مطبوعہ ۲۰۰۱ء صفحہ ۳۷۲)

میرے پہلے مجموعہ کلام ''آگ میں پھول'' کو ۱۹۵۹ء میں ''صدارتی ایوارڈ'' سے نوازا گیا جب کہ یہ کتاب ۱۹۵۶ء میں شائع ہوئی تھی۔

عالی صاحب نے اپنے خط میں میرے سہو تسامح کی وضاحت نہیں کی' البتہ بعد میں مجھے فون پر بتایا کہ وہ ''صدارتی ایوارڈ'' نہیں تھا بلکہ صدر پاکستان کا محض ایک تعریفی خط تھا اور مجھے بھیجی ہوئی رقم بھی ''عنایت خسروانہ'' کے مصداق تھی۔ عالی صاحب چونکہ ''سرکار دربار'' کے آدمی ہیں اور ان دنوں رائٹرز گلڈ کے ایک اہم افسر اور قدرت اللہ شہاب کے دست راست تھے اس لئے میں ان کی وضاحت کو درست ہی سمجھتا ہوں تاریخ میں حکمرانوں کی ایسی مثالیں بھی ہیں کہ

گاہے بسلامے بہ رنجند' گاہے بہ دشنامے خلعت بہ دہند

اچھا ہوا کہ میں اس ''نام نہاد سرکاری اعزاز'' سے بری قرار پایا۔

تنہا تماپوری (کرناٹک)۔ اپریل ۹۸ء

جناب حمایت علی شاعر کی منظوم خودنوشت سوانح حیات نے بے چین کر دیا ہے۔ کاش کہ پچھلی قسطیں پڑھنے کو مل جاتیں۔ شعریت سے بھرپور دل کو چھو لینے والی ایسی آپ بیتی میری نظر سے نہیں گزری۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

شہپر رسول (دہلی)۔ مئی ۹۸ء

حمایت علی شاعر کی منظوم خودنوشت بڑی مرصع اور دلچسپ ہے۔ میرے خیال میں یہ واقعی

قابل داد ہے۔ ورنہ بقول جذبی "لوگ تو طول کلامی سے بھی اکتا جاتے ہیں۔"

جاوید زیدی (ہیوسٹن)۔ مئی ۹۸ء

حمایت بھائی کی منظوم خودنوشت اور عالی جی کا "اصرار ورنگی ریکارڈ" خاصا دلچسپ سلسلہ ہے۔

ن۔م۔ نیازی (سکھر)۔ جون ۹۸ء

حمایت علی شاعر اپنی منظوم خودنوشت سوانح "آئینہ در آئینہ" میں حالات اور واقعات کے چہرے سے پردہ اٹھا کر بڑی خوبصورت اور فنی چابکدستی سے سچائی کا آئینہ دکھا رہے ہیں۔ موصوف کا یہ اہم ادبی کارنامہ ہے۔

احمد سعدی (ڈھاکہ۔ بنگلہ دیش)۔ جولائی ۹۸ء

مجھے سب سے زیادہ دکھ حمایت علی شاعر کے "آئینہ در آئینہ" کا سلسلہ ٹوٹ جانے کا ہے۔ خدا ان ڈاک والوں کو غارت کرے جو مسلسل یہ ظلم ڈھا رہے ہیں۔

انیس شاہ جیلانی (محمد آباد۔ صادق آباد)۔ ستمبر ۹۸ء

حمایت علی شاعر تاریخ سے خوب بے خبر نکلے۔ بنگالیوں کو زک دینے کے لئے جب پنجابیوں نے "ون یونٹ" بنایا تھا تو صوبے چار نہیں پانچ تھے۔ پانچواں صوبہ "بھاولپور" تھا جسے آپ "سرائیکی صوبہ" کہئے اور جب "ون یونٹ" ٹوٹا تو گریٹر پنجاب کے نام پر بھاولپور کو ہڑپ کر لیا گیا بھاولپور کی اپنی اسمبلی اور وزیر اعظم تھا۔ شاعر صاحب کس دنیا میں بستے ہیں۔

وضاحت

مغربی پاکستان میں صوبے چار ہی تھے صوبے کا وزیر "وزیر اعلیٰ" ہوتا ہے "وزیر اعظم" نہیں۔ پاکستان سے پہلے بہاولپور ایک ریاست تھی۔ اس کا وزیر اعظم بھی تھا مگر پاکستان بننے کے بعد نہ صرف بھاولپور بلکہ خیر پور میرس اور قلات جیسی ریاستوں کو بھی رفتہ رفتہ ختم کر کے پاکستان میں شامل کر دیا گیا۔ (مرتب)

محمد خالد اختر (کراچی)۔ اکتوبر ۹۸ء

حمایت علی شاعر کی منظوم خودنوشت سوانح حیات تو ایک منفرد ادبی ٹور ڈی فورس (Tour De Force) ہے۔ کس بظاہر آسانی، بے تکلفی اور روانی سے اپنی زندگی کی کہانی سناتے جاتے ہیں۔ سرگزشت کی دلچسپی میں بھی کمی نہیں آئی۔ میرے خیال میں ان کو اس شعری داستان گوئی کی اتنی داد نہیں ملی جس کے وہ مستحق تھے۔

پروفیسر عبدالقوی ضیاء (کینیڈا)۔ نومبر ۹۸ء

شاہین نے حمایت علی شاعر کی منظوم خودنوشت میں سقوط ڈھاکہ اور مشرقی پاکستان کی علیحدگی اور اس کے بنگلہ دیش بننے کی داستان کی طرف اشارہ کیا ہے۔

اس المیئے کے بارے میں بہت کچھ لکھا جاچکا ہے اور ابھی نہ جانے کتنا کچھ لکھا جائے گا۔ تاریخی اعتبار سے بھی، شعری اور افسانوی پیرائے میں بھی۔ شاہین غازی پوری غالباً یہ نکتہ فراموش کر بیٹھے کہ یہ سوانح حیات ایک شاعر نظم کر رہا ہے نہ کہ مورخ۔ حمایت نے نہ صرف انہیں تاریخی واقعات اور حادثات کو اپنے سوانحی خاکے کا حصہ بنایا ہے جو تجربات کی شکل میں ان کی زندگی میں براہِ راست یا عقبی دروازے سے داخل ہو کر ان کی فکر کا حصہ اور نظر کا ارتکاز بنے۔ انہوں نے شاعرانہ شعور اور بصیرت کے ساتھ ان واقعات کو موضوع سخن بنایا نہ کہ مورخانہ معروضیت کی ہم رشتگی میں۔ بہت سے حادثات اور سانحات جو رونما ہوئے ہیں ان سے وہ متاثر ضرور ہوئے اور اپنی سوانح حیات کا انہیں حصہ بنانے میں انہوں نے کوئی تامل نہ کیا مگر ایسے نتائج نہیں اخذ کیے جو مورخ کا کام ہے۔ ان کے مطالبات شاعر سے بے جا، بے معنی اور بے سود ہیں یہ توقعات تو مورخ سے رکھنی چاہئیں۔

پروفیسر ڈاکٹر عطیہ خلیل عرب (کراچی)۔ دسمبر ۹۸ء

جناب حمایت علی شاعر کی ''آئینہ در آئینہ'' خودنوشت سوانح نگاری میں ایک نادر اضافہ ہے۔

قیصر نجفی (کراچی)۔ جنوری ۹۹ء

جناب حمایت علی شاعر کی منظوم خودنوشت سوانح حیات اپنی نوع کی منفرد تخلیق ہے بلکہ ایک خاصے کی چیز ہے۔ عصری آگہی کے حوالے سے اس کی قدر و قیمت دوچند ہوگئی ہے۔ بیانیہ شاعری میں شعری محاسن کی گنجائش پیدا کرنا اور زبان و بیان پر یکساں طور سے مضبوط گرفت رکھنا حمایت علی شاعر جیسے مشاق شاعر کا ہی کام ہے۔

سلطانہ مہر (لاس اینجلس)۔جنوری ۹۹ء

حمایت صاحب کی منظوم آپ بیتی تاریخی حوالہ ثابت ہوگی۔انہوں نے لکھا تھا کہ اس پر ایک حلقے کی جانب سے خاص لے دے بھی رہی ہے۔ٹھیک ہے۔یہ سب ہوتا رہتا ہے۔مگر اسے جاری رہنا چاہئے۔ہر ایک کو اپنی بات کہنے کا حق ہے۔

رفعت سروش (دہلی)۔فروری ۹۹ء

''آئینہ در آئینہ'' تو حمایت کا شاندار کارنامہ ہے۔منظوم خودنوشت اور وہ بھی مثنوی کی طرح ایک ہی بحر میں، بہت مشکل کام ہے۔مگر حمایت نے اس نظم میں اپنی ذات کے علاوہ اپنے ماحول اور اپنے دور کا احاطہ بھی کیا ہے۔جب مکمل ہو جائے گی تو ایک نشست میں دوبارہ پڑھنے کا لطف ہی اور ہوگا۔

رؤف خیر (حیدرآباد دکن۔بھارت)۔فروری ۹۹ء

حمایت علی شاعر نے ''آئینہ در آئینہ'' کو جام جم بنا دیا ہے۔

نوشاد نوری (ڈھاکہ)۔مارچ ۹۹ء

میں نے افکار اگست ۹۸ء کے شمارے میں شاہین کا خط، ستمبر میں حمایت علی شاعر کا جواب اور پھر دسمبر میں شاہین کا خط بڑے دکھ کے ساتھ پڑھا اور صہبا سے گزارش کرنے کو جی چاہا کہ شاہین و شاعر جیسے باشعور شاعروں کے درمیان ان تلخ مراسلوں کا سلسلہ ختم کریں۔

بر سبیل تذکرہ یہ بھی عرض کرنا ہے کہ افکار میں چھپنے والی منظوم خودنوشت کے مرکزی کردار خود حمایت علی شاعر ہیں۔یہ ان کی اپنی سرگزشت ہے اور ان کے ذاتی واقعات، مشاہدات، تجربات اور ہیجانات کا احاطہ کرتی ہے۔میں ادبی جائزے، تاریخی تبصرے اور نظریاتی تنقید کا مخالف نہیں ہوں۔مگر کسی بڑے کارنامے میں چھوٹی چھوٹی باتیں چننا پھر بال کی کھال نکالنا کسی کو زیب نہیں دیتا۔

سید سلیم معینی (کراچی)۔مئی ۹۸ء

محترم حمایت علی شاعر کا ''جواب آں غزل'' نظر سے گزرا ان کا شکوہ بجا ہے۔افسوس کہ ہم پچھلے پچاس سال میں بھی حمایت کی عظمت اور مقام کو نہیں سمجھ سکے۔وہ شخص سقوط حیدرآباد کی ابتلاء

وآزمائش سے گزر کر اپنے اصولوں کو بچا کر یہاں آیا اور پھر لگن اور خلوص کے ساتھ وطنِ عزیز کی بے لوث خدمت کی۔ آج اس پر انگلی اٹھائی جارہی ہے۔ کیسی ستم ظریفی ہے کہ جس نے شعر و ادب کو ضیاء بخشی اور جلادی۔ اس کی حقیقت پسند کاوش کو شک و شبہ سے دیکھا جارہا ہے اور کیڑے نکالنے کے لئے تنقید کا مائیکرو اسکوپ لے کر نام نہاد نقادوں کی پوری ٹولی مشغول سعی ہے۔ حمایت علی شاعر کو میں جانتا ہوں۔ وہ ایک مخلص اور کھرے انسان ہیں اور ان کی پوری زندگی اس حقیقت کی آئینہ دار ہے۔ انہوں نے بنگلہ دیش (سابق مشرقی پاکستان) کے متعلق جو کچھ لکھا سچ اور صحیح تصویر ہے۔ اگر ہم اپنے ضمیر کو ٹٹولیں تو حقیقت آشکار ہو جائے گی۔ سچ ہمیشہ کڑوا ہوا ہے اور زہر کو پینے کے لئے سقراط کا جگر درکار ہوتا ہے۔

قائد ملت لیاقت علی خان کے بعد مغربی پاکستان کی قیادت نے حالات کو بگاڑنے میں چنگاری پر تیل کا کام کیا اور ۷۰ء کے انتخابات کے بعد کھلے عام کہا گیا کہ ہم کو زمین درکار ہے انسانوں اور آبادی کی ضرورت نہیں اور وہاں کے باسیوں کے ساتھ محکوموں اور غلاموں جیسا سلوک کیا گیا۔ دشمن تاک میں تھا۔ اس نے حالات سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور نتیجہ سامنے ہے۔ مگر مچھ کے آنسو بہانے والے ''ان بہاریوں کو جو اصل پاکستانی ہیں'' ان کے تصورات کی جنت میں لانے کے لئے تیار نہیں ہیں اور وہ انتہائی کسمپرسی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ آخر ان کا کیا گناہ ہے جس کی ان کو سزا دی جارہی ہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ ہم حقیقتوں کا سامنا کریں اور اپنی غلطیوں سے سبق حاصل کریں۔ شتر مرغ کی طرح ریت میں سر دینے سے مسائل کا حل نہیں نکلے گا۔

اکبر حیدر آبادی (لندن)۔ جولائی ۹۹ء

حمایت علی شاعر کی منظوم خودنوشت کے عکس ''آئینہ در آئینہ'' پوری آب و تاب کے ساتھ فروزاں ہیں۔ انہوں نے واقعات کو بالترتیب جس قطعیت کے ساتھ پیش کیا ہے اس سے ان کے حافظے کی بے پناہ فعالیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ لبکن مارچ کے شمارے کے صفحہ ۲۸ پر ان کا آٹھواں شعر ہے۔

دیارِ پاک سے ہندوستاں میں آیا تھا
میں اپنے گھر سے پھر اپنے مکاں میں آیا تھا

میرا خیال ہے یہاں انہیں کہنا چاہئے تھا کہ میں اپنے مکان سے اپنے گھر میں آیا ہوں نہ کہ اپنے گھر سے اپنے مکان میں۔ کوئی شخص اپنی ساری عمر بھی اگر کسی اور ملک میں گزار دے تو اپنے

پیدائشی مقام سے جو اس کا ذہنی اور روحانی تعلق ہے وہ اپنی جگہ ہے.... خود میری آدھی سے زیادہ عمر دیارِ مغرب میں گزر گئی اور باوجود یہ کہ یہاں ہر طرح کی سہولتیں اور آسائشیں میسر ہیں لیکن جو تعلق حیدر آباد سے ہے وہ کسی اور جگہ سے نہیں ہو سکتا۔ ہم میں سے بہت سوں پر میرا یہ شعر صادق آتا ہو گا۔

جب تین زمینوں سے اکبر اک خاص طرح کی نسبت ہے
کس مٹی کو اپنی مٹی کس ملک کو ملک اپنا کہتے

اس شعر میں تذبذب کی جو کیفیت ہے اس کے اسباب واضح ہیں لیکن جہاں ان نسبتوں کی اہمیت کا سوال ہے تو وہ صرف ایک جگہ کو حاصل ہے۔

مندرجہ بالا سوال کے جواب میں **حمایت علی شاعر** کہتے ہیں

بھائی اکبر صاحب۔ آپ نے حیدر آباد دکن سے "ہجرت" کی تھی میں نے "ترکِ وطن" کیا ہے "ہجر" میں وصل کی آرزو پوشیدہ ہوتی ہے مگر "ترک" میں واضح لاتعلقی کا عہد ہوتا ہے۔ چنانچہ ہم تارکین وطن کا "گھر" اب پاکستان ہے اور ماضی کی نسبتوں کے سہارے وہ "مکانی تعلق" حیدر آباد دکن (بھارت) سے باقی رہ گیا ہے۔ اسی لئے میں نے عرض کیا تھا کہ

میں اپنے "گھر" سے پھر اپنے "مکاں" میں آیا تھا

خدا دونوں ملکوں کو شاد و آباد رکھے۔ آمین

سلطان رشک (راولپنڈی۔ ستمبر 1999ء)

"آئینہ در آئینہ" جناب حمایت علی شاعر کی منظوم خود نوشت جو ان کی قادر الکلامی اور نادرہ بیانی کا منہ بولتا شاہکار ہے میں نہایت دلچسپی سے پڑھتا ہوں۔ اس میں اس صدی کے مشاہیر ادب کے علاوہ ہند و پاک کے تاریخی مذہبی، سیاسی اور سماجی پس منظر سے آگاہی ہو رہی ہے جس کے لیے مجھ سمیت سب قارئین افکار ممنون ہیں۔

ڈاکٹر شارب ردولوی (نکہت بریلوی کے نام ایک خط۔ 3 اگست 1999ء، لکھنؤ)

"افکار" برابر مل رہا ہے۔ اگست کا شمارہ کل ہی آیا۔ ابھی حمایت علی شاعر کی خود نوشت "آئینہ در آئینہ" اور ادا جعفری کی نظم "کبھی یوں تو نہیں ہوتا" ہی پڑھ سکا ہوں۔ دونوں ہی چیزوں نے متاثر کیا ہے۔ حمایت علی شاعر کو زبان و بیان پر جو قدرت ہے وہ کم لوگوں کو میسر آتی ہے۔ یہ خود نوشت بھی اردو میں ایک تاریخی چیز ہو گی۔

شفیع عقیل (کراچی)۔ ۴/ اکتوبر ۲۰۰۱ء

حمایت علی شاعر اردو کے نامور اور روشن خیال شاعر ہیں۔ ان کی تخلیقی سرگرمیوں کا عرصہ اتنا طویل ہے کہ آج کے بہت سے شاعروں کی اتنی عمر بھی نہیں ہوگی۔ وہ چھ دہائیوں سے شعروادب کی تخلیق کاری میں سرگرم ہیں اور خوشی کی بات یہ ہے کہ آج بھی اسی توانائی اور غور انگیزی سے لکھ رہے ہیں۔ ان کی تصنیفات و تخلیقات کی فہرست خاصی لمبی ہے اور انہوں نے نظم ونثر دونوں میں لکھا ہے اور پوری دلجمعی سے لکھا ہے۔ شاعری میں شاید ہی کوئی ایسی صنف ہو جس میں حمایت علی شاعر نے اپنی صلاحیت اور فنی مہارت کا ثبوت نہ دیا ہو۔ اس طرح انہوں نے کئی نثری اصناف میں بھی خوب لکھا ہے۔ وہ تنقید و تحقیق کے میدان میں بھی پیچھے نہیں رہے۔ اور تراجم میں بھی قابل توجہ کام کیا ہے۔ حمایت علی شاعر اگرچہ زیادہ تر قارئین میں ایک شاعر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں لیکن ان کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں۔ وہ درس و تدریس کے شعبے سے بھی وابستہ رہے ہیں' ریڈیو کے صداکار اور فیچر نگار بھی رہے ہیں' فلمی دنیا میں بھی گئے جہاں نغمہ نویسی اور مکالمہ نگاری کی بلکہ فلم ساز بھی رہے اور ہدایت کاری بھی کی۔ پھر صحافت کے میدان میں بھی آئے اور اپنا پرچہ بھی جاری کیا۔ مختصر طور پر یہ جان لیں کہ حمایت علی شاعر کو ادب' فن اور علم کے تناظر میں دیکھا جائے تو وہ واقعی ایک ہمہ جہت شخصیت ہیں۔ انہوں نے ادبی تخلیقات میں بھی کئی طرح سے جدت کا ثبوت دیا ہے۔ پہلے اردو شاعری میں ثلاثی کو متعارف کرایا اور اب اپنی منظوم سوانح حیات پیش کر کے ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ خودنوشت سوانح حیات تو بہت لکھی گئی ہیں لیکن یہ منظوم ہے اور حمایت علی شاعر کا کہنا ہے کہ یہ اردو زبان میں پہلی منظوم سوانح حیات ہے۔ اس بات کو اگر یوں کہا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا کہ یہ اردو میں پہلی باقاعدہ سوانح حیات ہے۔ باقاعدہ میں نے اس لئے لکھا ہے کہ بعض قدیم شعرا نے اپنی مثنویوں میں اپنی سوانح حیات منظوم کی ہیں۔ 1964ء میں ''الزبیر'' بہاولپور میں اردو کے معروف محقق مشفق خواجہ کا منظوم آپ بیتیوں کے بارے میں ایک مضمون شائع ہوا تھا جس میں واجد علی شاہ اختر کی منظوم خودنوشت ''حزن اختر'' کا تذکرہ ہے؟ جو بارہ سو پچاس اشعار پر مشتمل ہے اور اس میں شاعر نے اپنی اسیری کے حالات نظم کئے ہیں۔ تاہم حمایت علی شاعر کی منظوم خودنوشت کو اس لحاظ سے اولیت حاصل ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی کے حالات و واقعات ابتداء سے اب تک تسلسل کے ساتھ باقاعدہ نظم کئے ہیں اور شاعرانہ مہارت کے ساتھ کئے ہیں۔ شاعر نے صرف اپنے ذاتی حالات ہی نہیں لکھے بلکہ ان کی زندگی جن مختلف مراحل سے

باقی صفحہ ۱۰۱ پر

محمد احمد سبزواری

(ایک خط)

مورخہ 19 اپریل 2002ء کراچی

حمایت بھائی آپ کی منظوم خود نوشت مل گئی۔ بہت بہت شکریہ۔ میں نے اس پر جو اظہارِ خیال کیا تھا اس کو محترمہ رعنا اقبال نے منتخب تاثرات میں شامل کرلیا وہ تو ابتدائی دو قسطوں تک محدود تھا' میں کئی سال سے ''افکار'' میں کتابوں پر تبصرے کر رہا ہوں' آپ کی کتاب پر اس میں تبصرہ شائع ہو چکا ورنہ پوری کتاب پڑھنے کے بعد میرے تاثرات کچھ یوں ہوتے:

اس کہانی کی ابتداء ان معاشرتی ناانصافیوں اور ناہمواریوں سے ہوتی ہے جو ہمارے معاشرے میں بیواؤں' یتیموں' کمزوروں اور ناداروں سے روا رکھی جاتی ہیں جن پر اپنے بھی منہ موڑ لیتے ہیں' گھروں کا چین وسکون سگے سوتیلے کے چکروں میں برباد کر دیا جاتا ہے۔ کہانی کا پہلا اسٹیج اورنگ آباد کا وہ قدیم شہر ہے جو ملک عنبر اور اورنگ زیب کا مسکن رہا ہے مگر اب اس کی شان و شوکت پتھروں اور نیم شکستہ حویلیوں تک محدود ہے۔ اس ریاست کے ایک صوبے کا مستقر ہے جس کا والی ''خاوند'' کہلاتا ہے اور جس کا فرمان تھا کہ ع

مسلمانوں کا تیری سلطنت سے ہے نشاں باقی

مگر جب وقت آیا تو پوری سلطنت کی خوش گمانیاں اور خود فریبیاں دو ہی دن میں دودھ کے جھاگ کی طرح بیٹھ گئیں۔ اس وقت دکن میں مخدوم' جلیس اور لاہوتی جیسے سرپھروں کی کمی تھی مگر ان میں ایک الھڑ اور سب سے کمسن نوجوان کے کڑے تیور تو اسی وقت نمایاں ہونے لگے جب اس نے ''شیواجی'' کو دکن کا ''خوشحال خان'' کہا تھا۔ کس کو اندازہ تھا کہ ہوسٹل سے نکالا جانیوالا یہ سپوت ایک دن علم وادب کا آفتاب وماہتاب بن کر چمکے گا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب برصغیر کے علمی اور ادبی حلقوں میں ترقی پسند ادب کے اشتراکی پہلوؤں پر بحث چھڑی ہوئی تھی ادھر تانگانہ کے دیہات میں اشتراکیت کی آبیاری ہو رہی تھی۔ ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھے۔ وہاب نے لاہوتی کو مسلمان بنا کر اپنے گھر میں رکھا تو مخدوم کو ایک گجراتی برہمن گھرانے نے مادھو راؤ بنا رکھا تھا' یہ تھا وہ ماحول جس میں شاعر کی زندگی کے ابتدائی اوراق الٹ پلٹ ہوتے رہے۔

اس افراتفری کے عالم میں نوخیز شاعر کا دامِ محبت میں گرفتار ہو جانا بھی ایک حادثے سے کم نہ تھا۔ اس کیفیت کو وہ جس طرح محسوس کرتا ہے اس کا عالم بھی دیکھئے۔

چلتے چلتے جو قدم آپ ٹھٹک جاتے ہیں

سوچتا ہوں کہ کہیں تو نے پکارا تو نہیں

اور وہ سین بھی فلمی دنیا سے کم نہیں کہ دولہا بوقت نکاح اپنے خاندان سے دور سر جھکائے ملول بیٹھا ہے کہ دفعتاً والد آ کر چمٹا لیتے ہیں۔ یاد دلہن ''نئے وطن'' میں نہ معلوم کیا کیا ارمان لئے اپنی منزل پر پہنچتی ہے جو ایک جھونپڑی کی شکل میں منہ کھولے کھڑی ہے مگر آفریں ہے کہ آنیوالی اس شان سے داخل ہوتی ہے گویا قصر سلطانی میں قدم رکھ رہی ہے۔

یہ خودنوشت شخصی کہانی برصغیر کی حالیہ تاریخ ہے جس میں تمام چھوٹے اور بڑے واقعات اور اشخاص کو سمو دیا ہے۔ ملک میں اور بھی شاعر ہیں جنہوں نے بیرونی ممالک کے دورے کئے ہیں مگر ہمارے شاعر کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ کینیڈا' امریکہ' یورپ' اسکینڈین ممالک' اوسلو' کینیا' جنوبی افریقہ اور ماریشس نہ معلوم کہاں کہاں کے چکر لگا کر ساری دنیا کی محبتیں سمیٹ لایا ہے۔

شکست و ریخت کی اس کہانی میں جہدِ مسلسل بڑی نمایاں ہے۔ ہر منزل' پر عزم ہمت اور استقلال کے باعث کامیابی ان کے قدم چوم رہی ہے۔ جگر پارو کے نام وصیت میں: اپنی زندگی کے فلسفہ کا سارا نچوڑ سمو دیا ہے' اگرچہ یہ مسلسل بیانیہ شاعری ہے مگر یہ جتنی عام ہوگی اس کے متعدد شعر ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر لیں گے۔ زندہ باد حمایت!

بقیہ صفحہ ۹۹

گزری اور جس ماحول سے گزری انہوں نے اس کی جھلکیاں بھی پیش کی ہیں۔ اس طرح اس میں مختلف ادوار کے ارتقائی سماجی اور سیاسی حالات و واقعات کی تصویریں بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔ حمایت علی شاعر تادر الکلام فنکار ہیں اور ان کی یہ تازہ تخلیق اس کا ثبوت ہے۔ اگرچہ یہ بیانیہ شاعری ہے لیکن شاعر نے اس میں تاریخی' ادبی' تہذیبی' سیاسی اور ثقافتی حوالوں سے فکر و خیال کے رنگ بھر دیئے ہیں۔ یہ منظوم سوانح حیات 1995ء اور 1999ء کے دوران ماہنامہ ''افکار'' میں قسط وار چھپ چکی ہے۔ جواب کتابی صورت میں پیش کی گئی ہے۔ (مطبوعہ روزنامہ ''جنگ'' ۴/اکتوبر ۲۰۰۱ء)

ایک منفرد سہ ماہی ادبی جریدہ

خیال

ایڈیٹر رعنا اقبال

(بہت جلد شائع ہو رہا ہے)

ڈاکٹر اسلم فرخی

آئینہ در آئینہ

مقبول و معروف سخن گو حمایت علی شاعر کی چھب، انداز اور روپ تہہ در تہہ ہیں وہ معروف سخن گو ہیں - شاعری ان کا بنیادی حوالہ ہے لیکن اس بنیادی حوالے کے علاوہ بھی وہ اور بہت کچھ ہیں - میں نے انہیں سب سے پہلے ایک ذہین اور خوش آواز براڈ کاسٹر کے روپ میں دیکھا ہے - کراچی ریڈیو اسٹیشن پر یادش بخیر، پیش کش کے کیسے کیسے خوب صورت اور باوقار نام یاد آتے ہیں - وراثت مرزا، عبدالماجد، احمد عبدالقیوم، بدر رضواں اور حمایت علی شاعر بھی اسی جھرمٹ کا اختر تاباں تھے - ایک طالب علم کی حیثیت سے، مسودہ نگار کی حیثیت سے، ڈرامہ نگار کی حیثیت سے، فلمی گیتوں کی مدھم موسیقی کو لفظ و معنی کی وسعتیں عطا کرنے والے کی حیثیت سے، فلم ساز کی حیثیت سے، باوقار اور شفیق استاد کی حیثیت سے - ان کے ہر روپ میں نیا انداز اور نیا امکان ہے - شاعر سے غزلیں بھی سنیں، نظمیں بھی فردوس گوش ہوئیں، انہیں مشاعرے لوٹتے ہوئے بھی دیکھا اور سنجیدہ علمی محفلوں میں ان کی فکر کے برملا اظہار سے بھی آگاہی ہوئی - جو پہلو نظر آیا بھلا معلوم ہوا، اچھا معلوم ہوا اور اب ایک بالکل نیا پہلو - شاعر کی خود نوشت - لیکن نثر میں نہیں منظوم "کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لئے" شاعر نے ایک نئی وسعت تلاش کر لی -

حمایت علی شاعر کی اس نئی وسعت کا عنوان ہے "آئینہ در آئینہ" اور یہ چار سو صفحات پر محیط ہے - روداد اس خود نوشت کی یوں ہے کہ مرحوم صہباء لکھنوی نے شاعر سے خود نوشت لکھنے کی فرمائش کی - صہبا اپنے رسالے "افکار" میں متعدد مشاہیر ادب کی خود نوشتیں قسط وار شائع کر چکے تھے شاعر سے بھی فرمائش کی گئی اور اس شرط کے ساتھ کہ منظوم لکھو - شاعر نے ہمت کی اور یہ پہاڑ ہتھیلی پر اٹھا لیا - جنوں کی حکایات خوں چکاں لکھنے میں ہر ہر لفظ پر ہاتھ قلم ہو جانے کا اندیشہ تھا لیکن شاعر نے بڑے شاعرانہ سلیقہ سے حکایات لکھیں - نازک مرحلوں اور مقامات سے گزرنا پڑا تو مردانہ وار گزرے - نشیب و فراز کی داستان لکھی تو حقیقت پسندانہ انداز میں، واشگاف انداز میں پوری سچائی اور اعتماد کے ساتھ -

شاعر کی یہ خود نوشت ایک باحوصلہ انسان ایک غیور اور جہد مسلسل کے خوگر فن کار کی زندگی اور فنی سفر کی وہ روداد ہے جس میں انسانی بیچارگی، معاشرے کے جبر، ارباب اقتدار کی خوئے استقلال اور ہوس زر میں اخلاق و آداب کی پامالی کا بیان بڑے صاف اور واضح انداز میں ملتا ہے - ہمت شکن ماحول اور مسابقت کی فضاء میں کسی فن کار کا آگے قدم بڑھانا اپنی صلاحیتوں کو منوا لینا اپنی تخلیق اپج اور اپنی انفرادیت سے خاص و عام کو متاثر کر لینا یقیناً" اہم کارنامہ ہے - "آئینہ در آئینہ" کا مطالعہ اسی اہم کارنامے کو ہمارے سامنے لاتا ہے - شعر کے پیراہن میں نغمگی اور دل آویزی سے معمور "آئینہ در آئینہ" گزشتہ پچاس برس کی قومی اور سیاسی صورت حال کا نیم تاریخی جائزہ بھی ہے اس جائزے میں ایک حساس فن کار کا ذہنی اور روحانی رد عمل قاری کو متاثر بھی کرتا ہے اور اس میں حالات سے نبرد آزما ہونے کا ولولہ بھی پیدا ہوتا ہے - اسی طرح "آئینہ در آئینہ" گزشتہ نصف صدی کا منظر نامہ بھی پیش کرتا ہے - یہ منظر نامہ بڑا دلچسپ، ذاتی دید و دریافت پر مبنی، معاصرین کے اعتراف کمال اور ادبی رجحانات کا آئینہ بھی ہے - توضیحی حواشی سے اس خود نوشت کی افادیت میں بڑا اضافہ ہوا ہے -

"آئینہ در آئینہ" اعتماد و یقین سے مملو ایک نیا تجربہ ہے اس نئے تجربے سے نجانے کتنی راہیں نکلیں گی

(مطبوعہ - سہ ماہی روشنائی - اکتوبر تا دسمبر 2002ء)

پروفیسر آفاق صدیقی

آئینہ در آئینہ

''اپنی سوانح حیات لکھنا' دوبارہ جنم لینے اور دوسری زندگی از سرِ نو گزارنے کے مترادف ہے''۔ یہ بات ممتاز و مقبول شاعر و ادیب حمایت علی شاعر نے اپنی اُس منظوم خودنوشت سوانح حیات کے حرفِ اول میں لکھی ہے جس کی اشاعت کئی برس تک تو قسط وار ماہنامہ ''افکار'' میں ہوتی رہی اور اب ضخیم کتابی صورت میں دنیائے شعر و ادب کے لیے ایک منفرد ارمغانِ سخن ہے۔

نثری تصانیف میں تو خودنوشت سوانح حیات کی مثالیں ہمارے ادب کی تاریخ کا وقیع سرمایہ ہیں مگر منظوم رودادِ حیات کا ایسا نقشِ جمیل اپنی مثال آپ ہے۔ کمالِ فن یہ ہے کہ اس میں جن حالات و واقعات کو نظم کے سانچے میں ڈھالا گیا ہے وہ رسمی و رواجی سوانح حیات ہی کا مظہر نہیں بلکہ زمانی و مکانی اور تلخ و شیریں حقائق کی دل کش عکاسی نے اِسے ایک منظوم تہذیبی و ثقافتی اور سیاسی و معاشرتی تاریخ بنا دیا ہے۔ فکر انگیز و بصیرت خیز' مشامِ جاں کو مہکاتی ہوئی خوشبو کی طرح شاعر کے وجدان سے برآمد ہونے والی باتیں جو بھرپور شعری تاثرات کے ساتھ دلوں میں جذب ہونے کی خصوصیات رکھتی ہیں۔

قریب قریب نصف صدی پہلے حمایت علی شاعر نے طویل مگر پُر تاثیر نظمیں ''بنگال سے کوریا تک'' اور چند دیگر موضوعات پر لکھ کر شائقینِ ادب کو اپنا گرویدہ بنایا تھا۔ اس کتاب میں وہ تمام تخلیقی تجربے کچھ اس طرح نئے روپ سروپ میں ظاہر ہوئے ہیں کہ ہزاروں اشعار کی یہ منظوم داستان حیات بیانیہ آمد کا شاہکار محسوس ہوتی ہے۔ شعری اصطلاح میں ضرورت کے تحت کہیں کہیں ''آورد'' کا دخل ہے بھی تو انداز بیان کی رعنائی نے اسے بھی ''آمد'' کی شکل دے کر بے ساختہ' برجستہ اور شستہ و شائستہ بنا دیا ہے جب ہی تو پروفیسر جگن ناتھ آزاد جیسے ممتاز شاعر نے جو

منظوم خراجِ تحسین پیش کیا ہے اس میں حسین لہجے، متنوع جذبات و احساسات، گہری گہری سوچوں اور شاعرانہ محاسن کی قدر افزائی کرتے ہوئے نظم کے آخر میں فارسی کا یہ مصرعہ لکھ دیا ہے کہ ؎

''ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند''

اس منظوم خود نوشت سوانح حیات کا سوا گت ادبی حلقوں میں جاری و ساری ہے اور حقیقتاً اس میں وہ جان ہے کہ اسے ایک حوالہ جاتی کتاب کے طور پر بھی بڑی پذیرائی نصیب ہوتی رہے گی۔ کتاب کے آخری حصے میں ''حرف حرف روشنی'' کے زیرِ عنوان اپنے بچوں کے نام جو منظوم پیغام ہے وہ نسلِ نو کے لیے حبِ وطن، انسان دوستی اور وسعتِ فکر و نظر کا سندیسہ ہے جس کے بعد نثری آثار یہ ہے جو بہت ضروری تھا۔

(مطبوعہ، جون 2002ء ماہنامہ ہمدرد صحت کراچی)

حیدرآباد کی ادبی سیاست پر مبنی

احوالِ واقعی

مرتب

مرزا سلیم بیگ

(اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو، سندھ یونیورسٹی)

ناشر: مکتبہ نئی قدریں، حیدرآباد، سندھ

ڈاکٹر فہیم اعظمی

آئینہ در آئینہ

(مطبوعہ ۔ ماہنامہ ''صریر'' کراچی ۔ اگست ۲۰۰۲ء)

خودنوشت سوانح حیات یا AUTOBIOGRAPHY اردو ادب میں بہت کم مروج رہی ہے ۔ انگریزی ادب میں بھی یہ اصطلاح سب سے پہلے ۱۸۰۹ء میں ساؤتھے (SOUTHEY) نے استعمال کی تھی ۔ ڈاکٹر جونسن کا قول تھا کہ سوانح لکھنے کا سب سے زیادہ اہل وہ ہے جو خود اپنی سوانح حیات لکھتا ہے، لیکن اس امر کو متنازع سمجھا گیا اور یہ کہا گیا کہ یادداشت پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا اور لوگ اپنے بچپن کے بہت سے واقعات کو یاد نہیں رکھ سکتے ۔ کچھ تاثرات اہل خانہ، دوستوں اور رشتہ داروں کے بھی ہوتے ہیں مگر وہ بھی معتبر نہیں ہوتے ۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ لوگ وہی یاد رکھتے ہیں جو وہ یاد رکھنا چاہتے ہیں ۔ ماہرین نفسیات کا یہ بھی خیال ہے کہ تکلیف دہ واقعات (UNPLEASANT EVENTS) یاد نہیں رہتے حالانکہ وہ لاشعور میں محفوظ رہتے ہیں اور سمبلز کی شکل میں خواب میں، سرسام میں یا دوسرے لمحات پر جب سپر ایگو کمزور ہوتا ہے ورود کر جاتے ہیں ۔

خودنوشت سوانح حیات کے متعلق یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ زیادہ تر فکشن ہوتی ہیں.....

وہ خالص سچائی کے طور پر غیر معتبر ہوتی ہیں اور ان کی ادبی قدر مختلف ہوتی ہے (۱)

تاریخ میں سب سے پہلی مثال چوتھی صدی ہجری میں سینٹ آگسٹین کے ''اعترافات'' (CONFESSIONS) کی ملتی ہے ۔ اس میں تکشف اور روحانی و غیر مرئی باتوں کا ذکر ہے اور

(1) Dictionary of Literary Terms. J.A Cuddon p.64,65

اس دور کی علمی فکر کے مطابق ذاتی تحلیل نفسی ہے لیکن یہ قطعی طور پر آپ بیتی ہے اٹھارویں اور انیسویں صدی میں ایسی خودنوشت سوانح لکھی گئیں جن میں فکشن کا تاثر ملتا ہے مثلاً ڈینیل ڈیفو کا ''رابنسن کروسو'' اور اسٹرن (STERNE) کا ''جذباتی سفر'' (SENTI MENTAL JOURNEY) یہ سب نثر میں تھیں۔ انیسویں صدی کے نصف سے خودنوشت، کلی یا جزوی طور پر نظم میں لکھنے کا رواج ہوا۔ ورڈزورتھ کی نظم (THE PRELUDE) کو بھی خودنوشت سوانح گردانا جاتا ہے۔ اس طرح کی بہت سی مثالیں ملیں گی مثلاً جون اسٹورٹ مل کی خودنوشت سوانح حیات۔ بیسویں صدی میں بھی یہ صنف مقبول رہی مثلاً ۱۹۳۴ء میں ایچ جی ویلز کی EXPERIMENT (IN AUTOBIOGRAPHY) ۱۹۴۸ء میں جورج برناڈ شا کی خودنوشت (SIXTTEEN SELF SKETCHES) شائع ہوئے۔ ونسٹن چرچل کی ''MY EARLY LIFE'' ۱۹۳۰ء میں شائع ہوئی۔ یہ سب نثر میں تھیں۔

''آئینہ در آئینہ'' کی طرح منظوم خودنوشت کی مثالیں جن میں بیانیہ اور حقیقت نگاری کا اسلوب اپنایا گیا ہو انگریزی ادب میں کم ملتی ہیں۔ اردو ادب میں چیدہ چیدہ واقعات جو شاعر کی زندگی میں پیش آتے ہیں جن کی ہمارے سیاسی معاشرے میں کمی نہیں، نظم کئے گئے ہیں مگر ان کی حیثیت زیادہ تر خارجی ہے، جو تخلیق کار کی نجی زندگی سے منسلک نہیں۔ ''آئینہ در آئینہ'' میں سیاسی اور نظریاتی واردا تیں تخلیق کار کی زندگی، اس کے جذبات، اس کے محرکات پر پوری طرح چھائی ہوئی معلوم ہوتی ہے ایسے واقعات و نظریات کا امپیکٹ یہ ہوتا ہے کہ واردات اور واقعات کا بیان کم اور ان کے تاثرات کا اظہار زیادہ ہوتا ہے، یعنی یہ کہ تاثیریت (IMPRESSIONISM) اور اظہاریت (EXPRESSIONISM) کی ٹیکنیک واقعات کو پس پشت ڈال کر ان تاثرات کو اہمیت دیتی ہے جو تخلیق کار پر یا دوسروں پر مرتب ہوتے ہیں۔ یہ شعوری طور پر بھی ہوسکتا ہے اور غیر شعوری طور پر بھی۔ مثال کے لئے آئینہ در آئینہ کے چند اشعار ؎

خبر نہ تھی کہ یہ قانون جب بھی آتا ہے
تو پھر عوام سے رشتہ ہی ٹوٹ جاتا ہے

کبھی وڈیروں کبھی تاجروں کا ہوگا راج
جو یہ ہٹیں گے تو پھر آمروں کا ہو گا راج

یہ تو ہوا واقعہ، اور اس سے اخذ کئے ہوئے نتائج جو نظریاتی بنیادوں پر قائم ہیں۔ لیکن ان کی تفصیل یا جدلیاتی مادیت کی تھیوری پیش کرنے کے بجائے تخلیق کار ان اثرات پر زور دیتا ہے جو اس پر مرتب ہوئے۔

درون ذہن تھا اک انتشار، اک کہرام
سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا دوں اسے کیا نام
بس ایک وحشت بے نام دل پہ طاری تھی
دل و دماغ میں اک جنگ تھی کہ جاری تھی

آئینہ در آئینہ کی ساخت پر غور کیا جائے تو سوانحی واقعات کے طور پر مندرجہ ذیل باتیں ملتی ہیں۔ مقام پیدائش اورنگ آباد کا ذکر اور اس کی اساطیری، نشانیاتی اور تہذیبی اہمیت، اور اس شہر کی حالیہ دور کی زبوں حالی کا اشاریہ اپنے خاندان کا ذکر اور اس کی نسلی، مذہبی، حکومت وقت سے وفا شعاری کی کہانی ذاتی واقعات مثلاً تین سال کی عمر میں ماں کا انتقال، سوتیلی ماں کا پیار۔

یہ دادی ماں کی فراست تھی یا مرا مقسوم
ملی وہ ماں مجھے جو خود بھی ماں سے تھی محروم
جو غم گزیدہ ہو وہ مہرباں بھی ہوتا ہے
وہی شریک غم دیگراں بھی ہوتا ہے

شعور کی بلوغت، نوجوانی، عزیز و اقارب کے رویوں سے بے اطمینانی، ذہنی کشمکش اور اس دور کی بورژوا اور پیٹی بورژوا تہذیب سے نفرت اور پھر بغاوت کے عناصر کی نمو۔

میں سوچتا تھا کہ کیسے عجیب لوگ ہیں یہ
جو دیکھئے تو خدا کے قریب لوگ ہیں یہ

میں چاہتا تھا کہ اس جال سے نکل بھاگوں
منافقت کے مہ و سال سے نکل بھاگوں

سبب یہ تھا کہ مجھے اختلاف تھا سب سے
میں اپنے گھر میں خود اپنا رقیب تھا کب سے
میں اپنی عمر کے لڑکوں سے مختلف تھا بہت
ہر اک روایت کہنہ سے منحرف تھا بہت
کتابیں پڑھتا تھا ایسی جو باغیانہ تھیں
سبھی بزرگوں کی نظروں میں کافرانہ تھیں

اور ایک حسن اتفاق کا تاثر جو قرطاس سے کینوس پر منتقل کیا جائے تو تاثیریت کی ٹیکنک کا اعلیٰ نمونہ بن جائے۔

مجھے یہ دکھ کہ "ولی عہد" پر ہے میرا نام
نواب میر حمایت علی تھا اس کا نام
میں سوچتا کہ مرا خاندان بھی کم تو نہیں
حسب نسب میں علی کا ولی ہوں، سید ہوں
وہ باب علم تھے، میں خاک پائے سرمد ہوں
ہے فرق مجھ میں ولی عہد میں تو اتنا ہے
غریب زادہ ہوں میں، وہ امیر زادہ ہے
مگر غریب تو سارے عظیم لوگ رہے
تھے جو امیر وہ انسانیت کا روگ رہے

نظم کے اس حصہ تک پہنچ کر پیٹی بورژوا خاندان کے ان حساس لوگوں کو جو تخلیق کار کے

تقریباً ہم عمر ہیں (جس میں راقم الحروف بھی شامل ہے) اور بیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں برصغیر کے شہروں میں رہتے تھے" آئینہ" میں بجائے تخلیق کار کے اپنا عکس نظر آنے لگے گا۔ اس دور کا ہر لڑکا جو پیٹی بورژوا خاندان کی فرد تھا باغی تھا اور سماج واد سے گزر کر سامواد یا اشتراکی نظریہ کا حامی تھا۔ فرق تھا تو ڈگری کا۔ تخلیق کار کے سامنے آئینہ در آئینہ تھا، نو آبادیاتی نظام اور دیسی ریاست میں اس کا مقام۔ اور یہی شعور تھا جو اشتراکیت کے سبز باغ سے گزر کر روشن مستقبل کے خواب دکھاتا تھا۔ تخلیق کار کی عمر کے پیٹی بورژوا خاندان کے نوجوان کی نظریہ سازی کا دور۔ تحریک کی شدت یا (THESIS) کا دور تھا۔ اس کے بعد آئینہ در آئینہ میں وہ دور آتا ہے جس میں تخلیق کار نے ایسے خیالات کا اظہار کیا ہے جو متنازع ہو سکتے ہیں۔ تقسیم برصغیر اور سقوط ریاست حیدر آباد کے آثار، نقل مکانی، عشق کی تخم ریزی اور پھر رشتہ ازدواج ۔

دکن کے لوگ بھی کیا خوب تھے سیاست داں
سمجھ رہے تھے یہاں بھی بنے گا پاکستان
یہاں جو ایک مسلماں کی بادشاہت تھی
تو یہ سمجھتے تھے اسلام کی حکومت تھی
سو اب تو دلی میں ہو گا ہمارا اگلا قدم
اڑے گا لال قلعہ پر نظام کا پرچم
یہ خواب دیکھ رہے تھے سبھی امیر و غریب
تمام شاعر و فنکار، مولوی و خطیب
تو خیر اسی میں تھی، چپ چاپ زندگی کیجئے
"خدائے وقت" کی خاموش بندگی کیجئے

عمر کے اتنے حصہ میں شاعر کا فکری رجحان تو ظاہر ہوتا ہے اور یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ شاعر ترقی پسندوں میں شامل تھا اور صحافت میں صریر خامہ سے اس کا اظہار بھی ہوتا تھا۔ لیکن اپنے خیالات کو عملی جامہ پہنانے کا کوئی واقعہ پیش نہیں کیا گیا یا پھر اسے ان کہی چھوڑ دیا گیا ہے اور یہ بھی

ہوسکتا ہے کہ باغیانہ، ترقی پسندانہ اور آزادانہ سوچ کے ساتھ کوئی تجربہ ہوا ہی نہ ہو، ''چپ چاپ زندگی'' اور ''خاموش بندگی'' سے سمجھوتا کرلیا گیا ہو، اور عشق کی گود میں فکری پناہ حاصل کرلی ہو جس کا انجام خوش آئند تھا مگر جس میں بغاوت کا ایک عنصر بھی شامل تھا۔ اس عمر میں مسئلہ روزگار بھی ہوتا ہے جو شاعر کو درپیش تھا۔

اور پھر باغی بیٹے اور شفیق باپ کا ملن شادی کی ساعت ۔

میں اپنے سہرے کی لڑیوں میں سر جھکائے ہوئے
کسی خیال میں گم تھا نظر جھکائے ہوئے
کہ ناگہاں مرے ابا مجھے نظر آئے
(اور ان کو لے کر جو میرے سسر ادھر آئے)
تڑپ کے میں بھی اٹھا اور لپٹ گیا ان سے
قدم کو چھو کے کچھ ایسا چمٹ گیا ان سے
کہ جیسے اب جو الگ ہوں تو چھوٹ جائیں گے
نہ صرف میں مرے ابا بھی ٹوٹ جائیں گے

یہ اشعار نفسیاتی تجزیہ کی بنیاد فراہم کرتے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ ہزار بغاوت اور نافرمانی کے باوجود باپ ایک ''فادر فیگر'' ہوتا ہے جس کا اعتقادی سلسلہ آسمان کے پرے تک پہنچتا ہے اور ایمان، انحصار غیر منطقیت کی بنیادیں مہیا کرتا ہے جو پڑھی، سیکھی اور امپورٹڈ جدلیاتی مادیت سے بالاتر ہوتی ہیں، زندگی کے آگے کے سفر میں یہی جذباتی لگاؤ تھا جس نے اعتقاد اور ایمان میں ڈھل کر اِگو (EGO) کی کارکردگی اور اختیاری حب الوطنی کو جنم دیا۔

نئی زمیں ہو تو کیا آسماں تو ہو گا وہی
خدا تو ہو گا وہی مہرباں تو ہو گا وہی
سو میری سوچ ارادے میں ڈھل گئی اک دن
ارادہ بن کے زباں سے نکل گئی اک دن

شفیع ، خواجہ ، نصیر اور عروج ساتھ ہوئے
وطن سے اپنے برائے خروج ساتھ ہوئے
ہر اک نظر میں تھا اب غیر ملک ہندوستان
سمجھ رہے تھے کہ ان کا وطن ہے پاکستان

اور پھر ہجرت۔ لیکن اپنا آبائی وطن چھوڑنے کا کرب اپنی جگہ تھا خصوصاً جب ماں باپ اور بچوں کو چھوڑ کر جانا ہو۔ مگر اس کرب کے جنم دینے والے عناصر میں بے روزگاری اور اپنے آبائی وطن کی جواب ہندوستان کے قبضہ میں تھا، فرقہ ورانہ سیاست اور تعصب جس نے ادب اور انسانیت اور ترقی پسندی پر شاعر کے یقین کو متزلزل کر دیا۔

تھی دفترانہ سیاست کہ فرقہ وارانہ
میں نوکری سے نکالا گیا حریفانہ
نہ صرف میں مری بیوی کو بھی ہٹایا گیا
کلہاڑا اس پہ بھی تخفیف کا چلایا گیا
نہ کوئی جرم نہ الزام بس خداحافظ
ملا تو یہ ملا انعام، بس خدا حافظ

اس کے بعد پاکستان میں آمد، کراچی وکٹوریہ کے سفر کا ذکر جس میں کیماڑی سے بندر روڈ ہوتے ہوئے، خداداد کالونی کے آس پاس کی مہاجر بستیوں کا تذکرہ ہے۔ ہجرت کر کے کراچی آنے والوں کا ذکر بڑے طنزیہ انداز میں کیا گیا ہے۔ اس سے گمان ہوتا ہے کہ شاعر کو ہجرت کر کے پاکستان آنے والوں اور پھر یہاں اپنا دکھڑا سنانے والوں سے ہمدردی نہیں تھی۔

یہ شہر، شہر کراچی دیار پاک کا دل
تمام ہجرتیوں کی یہ آخری منزل
ہزار طرح کے انساں یہاں پہ رہتے ہیں
وہی جو خود کو غریب الدیار کہتے ہیں

سنا ہے اپنے بھرے گھر وہ چھوڑ آئے تھے
بنام پاک ہر اک رشتہ توڑ آئے تھے
زمیں، دکان ،حویلی ہرے بھرے باغات
تمام کھیت ، ملیں اور تمام مصنوعات
زر و جواہر و زیور، خزانہ و دولت
لٹا کے سب ہی بچا لائے تھے فقط عزت
یہ لوگ کون تھے کیا جھوٹ اور کیا سچ تھا
سنا ہے ان میں بھی پوشیدہ کوئی لالچ تھا
زبان حال پہ افسانہ ہائے مظلومی
طلب کا آئینہ ہر داستان محرومی

اور مہاجروں کے کردار کے بارے میں شاعر کہتا ہے ''اپنی پاکستان سے محبت اور ہندوستان کے ظلم کی وجہ سے ہجرت کر کے آئے لیکن مفاد پرستی کو راہ دیا''۔ بین السطور ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جس جرنلائزیشن سے اشعار میں اس بات کا ذکر کیا گیا ہے وہ درست نہیں۔ شاعر کا مشاہدہ اور تجربہ بھی ان تک محدود ہے جن سے اس کا سابقہ پڑا لیکن اس بات کو واضح کیا جاتا تو بہتر تھا۔ اور پھر ایک ترقی پسند شاعر کی روداد میں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس کے مشاہدے میں بہت سی باتیں آئیں جو شاعر کی اپنی رائے تو کہی جا سکتی ہیں لیکن بہت متنازع ہیں۔ مثلاً پنڈی کانسپریسی کیس (PINDI CONSPRACY CASE) کی واردات کے متعلق شاعر کہتا ہے ۔

پھر ایک دن یہ اچانک ہمیں ہوا معلوم
یہاں پہ فیض وہاں قید ہو گئے مخدوم
جناب راج بہادر، روی نرائن بھی
اور ان کے ساتھ تلنگانے کے سبھی باغی

وہاں تو خیر الیکشن کا اک بہانہ تھا
یہاں مگر کسی سازش کا شاخسانہ تھا
چنانچہ ہند میں پیرول پر رہا بھی ہوئے
اور اس کے بعد الیکشن میں سب ہی جیت گئے
مگر یہاں تھے گرفتار بے بھلائی بھی
اور ان کے ساتھ ہی کچھ افسران فوجی بھی
کہا گیا کہ یہ پنڈی کی ایک سازش ہے
درونِ خانہ وطن توڑنے کی کوشش ہے
حکومت ان کو سمجھتی تھی باغی و غدار
مگر عوام تھے ان پر ہزار جاں سے نثار
وہ جیل جا کے بھی لوگوں کے دل میں رہتے تھے
کسی بھی حال میں وہ بات سچی ہی کہتے تھے

پنڈی سازش کیس یقیناً ایک سازش تھی چونکہ یہ اشتراکیوں کی سازش تھی جس میں اس زمانے کا ادب بھی حصہ دار تھا اس لیے آئینہ دار آئینے کے خالق نے اسے نظریات کے آئینے میں دیکھا لیکن یہ بات اتنی نہیں کہ اس پر یقین آ جائے کہ تمام لوگ زبردستی پکڑ لیے گئے تھے اور اس سازش کا کوئی وجود نہ تھا شاعر کے مطابق "عوام ان لوگوں پر ہزار جاں سے فدا" تھے جو اس سازش کیس میں گرفتار ہوئے تھے ہمیں عوام کی کسی تحریک کی شہادت نہیں ملتی جو اس موقف کو درست ثابت کرے ترقی پسند جماعت کے لوگوں نے بھی کھلم کھلا مطالبات پر کھل کر ان سے ہمدردی کا اظہار نہیں کیا ہاں شاعر نے اپنے کلام کے ذریعے ترقی پسندی کا اظہار ضرور کیا ہوگا مگر

مگر جناب بخاری نے کی نصیحت بھی
کہ یہ دکن ہے نہ مخدوم کا تلنگانہ
یہاں پہ جینا پڑے گا مجھے "شریفانہ"

سو میں نے صبر کیا اور نوکری کر لی
قلم پہ جبر کیا اور نوکری کر لی

مجبوری ضرور تھی مگر ایک راسخ العقیدہ اشتراکی کے لئے رجعت پسندی اور پیٹی بورژوا طبقے کی موقع پرستی کو کیا کہیے۔ شاید حالات کا تقاضا یہی تھا۔

کراچی میں اس زمانے کی ادب کی صورت حال کے بارے میں شاعر نے سچی باتیں کی ہیں لیکن جب ادب برائے ادب اور جدیدیت کی بات کرتا ہے تو پھر بات متنازع ہو جاتی ہے اور شاعر کی رائے خاص نظریاتی بنیادوں پر استوار ہو جاتی ہے۔ یہ کوئی سوانحی واردات تو نہیں ہے لیکن اس تاثر اور (IMPRESSION) کا بیان ہے جس کی بنیاد دلیل نہیں بلکہ نظریات ہیں۔

ادب کا حال بھی تھا دیدنی بفضل خدا
ادھر کا حلقہ الگ اور ادھر کا حلقہ جدا
جو انجمن تھی ترقی پسند ادیبوں کی
وہ اک سیاسی جماعت قرار پائی تھی
کوئی ادیب جو سرکار کا ملازم تھا
اس انجمن سے اسے اجتناب لازم تھا

ادب برائے ادب کے جو لوگ تھے حامی
وہ ان میں دیکھ رہے تھے کچھ اور ہی خامی
ہر اک کلام کو وہ باغیانہ کہتے تھے
اور اس ادب کو بہت عامیانہ کہتے تھے
صحافتی تھا یہ وقتی تھا بلکہ لمحاتی
نظیر ہی کی طرح پوچ اور خرافاتی

ادب تھا ان کی نظر میں ابد کا آئینہ
زبان ہو کہ بیاں اب و جد کا آئینہ
عوام اور شرفا میں جو حد فاصل ہے
وہی مقام حقیقت میں فن کی منزل ہے

جو کچھ شاعر نے ان اشعار میں کہا ہے اس کا اطلاق کلاسیکی اور نیم کلاسیکی یا رومانی ادب پر ہوتا ہے اور فائقی یا (ELITE یا SUBLIME) ادب یقیناً عوام کی دسترس میں نہیں ہوسکتا۔ ادب عوام کو پیغام پہچانے کے لئے نہیں ہوتا کیونکہ عوام اسے سمجھ ہی نہیں سکتے۔

جدیدیت بھی اسی جستجو کا ہے اک نام
ابد کی بات ہو لیکن بہ صورت ابہام
درون لفظ ہو معنی کی شکل تجریدی
خیال و خواب کا ہو اک جہان پر اسرار
علامتوں میں ہو پوشیدہ زیست کی پیکار
ہو تجزیہ کسی موہوم داخلیت کا
پڑے نہ عکس کہیں سے بھی خارجیت کا

کلاسیکی، رومانی ادب اور جدیدیت کے بارے میں جو کچھ شاعر نے لکھا ہے وہ اختصار کے ساتھ تمام عوامل کا احاطہ کرتا ہے لیکن طنز کی جھلک نمایاں ہے۔ چند اشعار میں جس طرح ان نکات کی عکاسی کی گئی ہے وہ قابل تعریف ہیں۔ یہ بات صرف تعریف یا (DESCRIPTION) کے متعلق درست ہے۔ لیکن شاعر کا اپنا موقف پوری طرح نظر آتا ہے۔

جو زندگی کے مسائل کا ترجماں تھا ادب
جو آدمی کا تھا آئینہ، وہ کہاں تھا ادب

یہ بھی ترقی پسند شاعر کی رائے ہے لیکن اس پر بحث ہوسکتی ہے۔ مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ ترقی پسند یا عوامی ادب آئینہ در آئینہ کہاں تھا۔ وہ تو سیدھا رکھا ہوا ایک آئینہ تھا جس میں ایک پروڈکشن ٹول کا

عکس اور اس کا عملی اطلاق نظر آتا تھا۔ بہیں کھلی آنکھوں سے جب کہ ذہن و فکر کی کارکردگی معدوم تھی۔ آئینہ در آئینہ تو جدیدیت کا تھا جس میں بھانت بھانت کے چہرے نظر آتے تھے۔ فرد اپنی تمام عظمتوں کے ساتھ چلتا پھرتا سوچتا نظر آتا تھا۔ صرف میکانکی اور نہیں تھا۔ اختلاف اور اتفاق کی بات اور ہے لیکن چند اشعار میں جس اجمال اور خوبصورتی سے ادب برائے ادب، ادب برائے زندگی، ترقی پسند ادب اور جدید ادب کے فرق کو پیش کیا گیا ہے وہ قابلِ داد ہیں۔

اس کے بعد اس دور کے جدید اور ترقی پسند ادباء کے حلقے کی چپقلش جو تھیں اور آتی تھیں دور میں تھے شاعر کے یہاں ایک بیٹے کی پیدائش اور اسے "روشن خیال" سے موسوم کرنا۔ مشاعروں میں شرکت اور سکھر میں شیخ ایاز سے ملاقات کا ذکر۔ پھر ریڈیو سے فلم تک اور پھر کچھ باتیں ریڈیو اور فلم کی اپنی محنت اور لگن کی۔

ہر ایک صنفِ ادب میں قلم سے کام لیا
کوئی ہو گوشۂ فن، حرف نے مقام کیا
غزل، رباعی، ثلاثی، علامتی تمثیل
طویل نظم، ڈرامے، فسانوی تشکیل
غنائیے بھی لکھے، قومی گیت بھی لکھے
ادب کے ساتھ کئی فلمی گیت بھی لکھے
کہیں کہیں تو بہت کامیاب پایا ہے

اس طرح فلمی گیت لکھنے کی کہانی اور خوش نمائی ہے۔

وہ ریڈیو ہو کہ اسٹیج، فلم یا ٹی وی
ہر ایک فن میں نمایاں تھی کوشش میری

فلمی دنیا میں جانے کے بعد ایک نیا تلخ تجربہ اور طویل نظم "واویلا" میں اس کا تذکرہ۔ لیکن ادب کے شیدائیوں کو خراجِ تحسین ہے۔

وہ جن کی ذات سے ہے معتبر ادب کا نام
نثار کرتے تھے مجھ پر خلوص صبح و شام

اس کے بعد ملک کے سیاسی حالات، ایوب خان کے دور کی غلطیاں، سیاسی اور فوجی شکست، مشرقی پاکستان کا علیحدہ ہونا اور واقعات کا بیان جو بالکل حقیقت پر مبنی ہے جس میں کسی خاص نظریہ کی جھلک نہیں ہے۔ چند اشعار:

وہ وقت اور تھا پیشتر سے مختلف تھا بہت
کسی پہ ہو نہ ہو مجھ پر تو منکشف تھا بہت

ادھر تھی فوج، ادھر تھی بغاوت ہر سو
چھڑی ہوئی تھی وہاں جنگ باہمی ہر سو
نہ دین سے کوئی نسبت نہ قدر مذہب کی

عوام کا ہر ایک انداز باغیانہ تھا
مگر ہمارا ہر انداز حاکمانہ تھا
سو اقتدار نے کیا وہ جو اس کی خواہش تھی
(وہاں ہمارا وطن توڑنے کی سازش تھی)

اور پھر نوحہ نما اشعار جو ہم سب کے دلوں کے ترجمان ہیں:

تھے اب تو ملک بھی دو اور حکمران بھی دو
ادھر مجیب، ادھر ذوالفقار علی بھٹو
وہاں عوام پہ طاری تھا قومیت کا جنوں
یہاں شکست و ندامت سے سب کا حال زبوں

وہاں یہ فخر کہ آزاد ہو گئے ہم لوگ
یہاں یہ غم تھا کہ برباد ہو گئے ہم لوگ
جو ملک قائد آعظم کا تھا وہ ٹوٹ گیا
خود اپنے ہاتھوں سے اپنا نصیب پھوٹ گیا

اور پھر ایک شکوہ اور۔

وہ لمحے بن گئے تاریخ اور ہم چپ تھے
زباں تو خیر زباں تھی مگر قلم چپ تھے

یہ کوئی راز تھا یا بے حسی ہماری تھی
کہ اپنی ''خاص سیاست'' کی پاسداری تھی
تھی مجرمانہ خموشی کہ مصلحت کوئی
جدیدیت کا تقاضہ ہے پردہ داری بھی
علامتوں ہی میں ہو واقعہ نگاری بھی

کچھ اس طرح سے کہ حیراں ہو استعارہ تک
کنائے میں بھی نمایاں نہ ہو اشارہ تک
خبر نہ ہو کہ یہ اپنی کوئی حقیقت ہے
ہمارے ''اپنے نظریئے'' کا وقت رخصت ہے
ادب ہو ایسا تو ہم بے ادب کہاں سمجھیں
جدیدیت ہی کے کچھ خاص نکتہ داں سمجھیں

جدیدیت کے خلاف حقیقت نگاری کے اس طنزیہ اظہار میں صرف ایک بات سچی معلوم ہوتی ہے۔ ہمارے اپنے ''نظریہ کا وقت رخصت ہے''، مگر وہ بھی اگر ''ہمارے اپنے'' سے مراد خود شاعر اور

دوسرے ہم خیال حقیقت نگار ہوں۔ اب یہ اشعار دیکھئے ۔

میں سوچتا تھا کسی نے تو کچھ لکھا ہو گا
کہیں تو جھوٹ کو سچ سے الگ کیا ہو گا
بلا سے اس کو نہ مانیں ادب ہمارے لوگ
کبھی تو آئینہ دیکھیں گے سچ کے مارے لوگ
کبھی تو اپنے لہو کا حساب مانگیں گے
خدا سے شاعر مشرق کا خواب مانگیں گے

ان اشعار میں ''جھوٹ کو سچ سے الگ'' آئینہ دیکھیں گے سچ کے مارے ''شاعر مشرق کا خواب'' کیا یہ سب جملے اپنے اندر ایسی علامتیں اور معنی کی نسبی (RELATIVE) تہیں لیئے ہوئے نہیں ہیں جن سے شاعر نے بیزاری کا اظہار کیا ہے؟

یہی نہیں بلکہ سویلین چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کے دور میں جو جبر تھا (اور جو عرصے تک قائم رہا) اور جس نے اخبارات اور حقیقت نگاروں کو خاموش کر دیا، اس پر شاعر خاموش کیوں رہا؟ شاید یہ آپ بیتی یا براہ راست مشاہدہ نہیں تھا۔ لیکن اس دور میں کچھ جدیدیت پسند لوگ بھی تھے جنہوں نے ایسے اشعار کہے ۔

ناخدا بن کے ایک پھر آیا
جس میں سیاسی شعور کوئی نہ تھا
عیش و عشرت تھا شیوہ ٔ اولی
کشتی قوم کس طرح کھیتا؟
ابتدا میں مگر ہوا مقبول
کر کے جمہوریت کو پھر سے قبول
دے کے موقع عوام کو اس نے
ملک میں پہلے انتخاب کئے

نقطہ عقلمندی تھی یا کہ تھی غلطی
یہ تو تاریخ خود بتائے گی
ہاں مگر یہ رہے گا ہم کو یاد
یہ تھی تقسیم ملک کی بنیاد
ملک میں بن گیا اکھاڑا سا
خود غرض سیاسی پہلوانوں کا
اپنے دشمن نے اس کو بھانپ لیا
حملہ کرنے کا وقت موزوں تھا
لے کے پہلی شکست کا بدلہ
اس نے ہم کو ذلیل و خوار کیا

اور اب ہم کو کچھ نہیں معلوم
زندہ کب ہو گی ملت مرحوم
لیڈری کے بڑے ہیں دعویدار
کون جانے کہ کون ہے غدار
سب کو دعویٰ ہے وہ مسیحا ہے
ان میں ہی موت کا فرشتہ ہے
قوم و ملت کا فلسفہ کیا تھا
اب تو یہ سب ہی ہم کو بھول گیا
بولتے ہیں سیاسی اہل زبان
کتنے معنوں میں لفظ پاکستان

ہم مسلماں تھے وقت آزادی
اور اب اشتراکی و نازی

ایک جدید اور علامتی نظم کے کچھ اشعار جس کو سقوط مشرقی پاکستان اور اس کے بعد کے پاکستان کی حالات کے حوالے سے دیکھا جائے تو سمجھنے میں کوئی دقت نہ ہوگی۔

اے آفتاب تیری حرارت کو کیا ہوا؟؟
آتش ماہتاب تیری تمازت کو کیا ہوا؟؟
کیوں سرنگوں ہے دھند کے بادل کے سامنے
دل بجھ گیا ہے کیوں تری جرأت کو کیا ہوا؟؟
کیا راکھ ہو گیا ہے ندامت کے بوجھ سے
آتش فشاں روز قیامت کو کیا ہوا؟؟
سوتوں کو تو جگاتا تھا کھڑکی سے جھانک کر
رواں شعلہ تیری شرارت کو کیا ہوا؟؟

یہ چند اشعار ایک نظم ”دھند“ کے ہیں جو اصل میں سقوط مشرقی پاکستان کے بعد صحافیوں اور دانشوروں کو مخاطب کر کے کہے گئے تھے۔ کیا ان میں ”سمجھنے“ اور خاص طور سے ان کے سمجھنے کی کوئی بابت نظر آتی ہے۔ بہرکیف یہ شاعر کا نقطہ نظر تھا جس سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔

اس کے بعد شاعر نے فلم سازی کی حیثیت سے اپنی کامیابی اور پھر بقول شاعر جعلی لوگوں سے عدم اشتراک کا ذکر جس کے بعد دوسری فلم میں مزید کامیابی ممکن نہ ہو سکی۔ شاعر کا خیال تھا کہ سندھ کی تاریخ اور اس کے ماحول میں ان کی فلم تجربہ سازی کے عمل سے مختلف ہو جو عام طور پر جاری تھا۔ لیکن اسی تجربہ سازی کے رجحان کی وجہ سے اس پروجیکٹ میں شاعر کی ناکامی۔

میں اپنی فلم کو وہ رنگ و روپ دے نہ سکا
سراب سامنے تھا اپنا دو کھے نہ سکا

بنا سکا نہ میں ''گڑیا'' کو کاروباری فلم
ریلیز ہو نہ سکی آخرش ہماری فلم

اور پھر سیاست، زبان کا مسئلہ، اور بھٹو کے دور کے متعلق کچھ سچی باتیں ۔

جناب بھٹو بڑے قائد عوام سہی
خواص میں بھی بہت ان کا احترام سہی
تھے عقلمند بھی لیکن نہیں تھے دور اندیش
خوشامدی تھے بہت جمع ان کے گرد و پیش
نظر میں پھر کوئی ''عالی مقام'' کیا جچتا
کوئی ہو ان کے نشانے سے شاذ ہی بچتا

عظیم راہنما کی عظیم تھی ہر بات
وہ چاہے رات کو دن کر دے اور دن کو رات

جو خواب دیکھ رہے تھے سو یہ ملی تعبیر
گلے میں موت کا پھندا تھا پاؤں میں زنجیر
بہت ذہین تھے قابل تھے سائیں کیا کیجئے
پہ آپ اپنے ہی قاتل تھے سائیں کیا کیجئے
ادھر بکھرنے سمٹنے کا یہ ہوا انجام
مجیب کو بھی ملا بنگلہ دیش کا انعام

اس کے بعد فلم چھوڑ کر حیدر آباد میں واپس آنے کا قصہ جس میں اپنے ادبی حریفوں کے متعلق اور عمومی طور پر ادبی فضا کے متعلق جس میں سندھ اور کراچی کے ادیبوں کی مخالفت کا ذکر ہے، اور کچھ دوسرے ادیبوں کے متعلق ایسی زبان استعمال کی گئی ہے جس سے شاعر کے کرب کا عندیہ ملتا ہے۔

میں فلم چھوڑ کے پھر آ گیا تھا حیدر آباد
وہاں پہ جامعہ سندھ میں تھا اب استاد

وہاں تھے میرے وہ سب دوست وہ رقیب سبھی
ادب کے نام پہ کرتے رہے جو "بے ادبی"
وہ "رو سیاہ" سیہ ظاہر و سیہ باطن
وہ جس پہ فقرہ کسا تھا "علیم" نے اک دن
وہ اپنے دل کی سیاہی کو اپنے منہ پہ ملے
بکھیرتا تھا اندھیرے ہر اک چراغ تلے

اس طرح جب وہ جمع سے واحد کی جانب آتے ہیں اور "سبھی رقیب" میں سے ایک کا انتخاب کرتے ہیں تو راقم الحروف کو نہیں معلوم کہ کس ادیب کی جانب اشارہ ہے۔ شاعر کے اس مفروضے کے باوجود کہ اس کا نام کس کو نہیں معلوم۔ شاید یہ "جدیدیت" کی درون بینی اور بقول شاعر پراسراریت اور علامت ہے جس سے وہ خود نالاں ہے۔ یا شاید خوف؟ کس بات کا؟

اپنے کچھ ادیب دوستوں کے ذکر کے بعد جس میں سلیم احمد، شمیم احمد، قمر جمیل وغیرہ سے ادبی رشتہ اور بے زاری و قدر دانی کی بات کی گئی ہے، امریکہ اور کناڈا کا سفر، پاکستانی معاشرے اور مغربی معاشرے میں فرق۔ سب وے ٹرین اور طیاروں کا ذکر۔ مغربی ممالک کے قانون، سیکولرازم کی تعریف، اور عمومی طور پر وہاں کے افراد کے کردار اور ترقی کی تعریف۔ اختتام اس خوبصورت طنزیہ شعر پر ۔

وہ جستجو کی ہے دنیا یہاں قناعت ہے
یہاں ارادہ تو کیا سوچنا قیامت ہے

ایک موقع پر زبان کے بارے میں بات کرتے کرتے شاعر نے سندھی زبان کی وکالت کی جو حق بجانب ہے لیکن اس بات پر شعوری یا غیر شعوری طور پر غور نہیں کیا گیا کہ پاکستان کی قومی زبان اردو تھی اور علاقائی زبان کے ساتھ اردو اور اردو کے ساتھ علاقائی زبان سیکھنا ضروری تھا۔ بات صرف اتنی تھی اور ہے کہ اردو زبان پاکستان کی پہچان ہے اور علاقائی زبان علاقے کی، علاقائی زبانوں کو کہیں بھی نقصان پہچانے کی کوشش نہیں کی گئی ہاں اردو کے ساتھ البتہ زیادتی ہے کہ وہ ابھی تک ملک کی سرکاری زبان نہ بن سکی۔ علاقائی زبان کے شعراء نے جن میں شیخ ایاز بھی شامل ہیں عالمی شہرت حاصل کی وہ اردو زبان کی بدولت۔ ایوب خان کے دور میں کم

...یزی سے جاری تھا کہ اردو کو جلد سے جلد قومی زبان کا درجہ دیا جا سکے زیادہ خیال یہ تھا کہ اردو انگریزی کی جگہ لے لے گی۔ اس سلسلے میں اسکولوں کی درسی کتابوں سے ابتدا کی گئی تھی اگر وہ کام جاری رہتا تو اب تک اردو قومی اور سرکاری زبان بن چکی ہوتی۔ سویلین یا مارشل لا ایڈ منسٹریٹر کے دور میں اردو کے ساتھ زیادتی کی گئی جس پر اردو زبان کے تحفظ کا سوال پیدا ہوا تھا۔ کسی زبان کی غیر علاقائی اور غیر زبان والوں وکالت کرے تو اچھا لگتا ہے مگر کو اتفاق کو غیر جانب دارانہ طریقے سے پیش کرنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ خصوصاً جب کسی مسئلہ سے قومی یکجہتی اور قومی آئین کا سوال پیدا ہو۔

ان اشعار میں ہندوستان میں اپنے آبائی شہر قرب و جوار اور اپنے آبائی مکان کی زیارت کو بڑے پر خلوص اور جذباتی اور موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے

ہر ایک چیز تھی میری مگر نہ تھی میری
نظر تھی میری، متاعِ نظر نہ تھی میری
نہ راستے نہ محلے نہ کوچہ و بازار
نہ گولکنڈہ نہ موسی ندی نہ چار مینار

وہ دو دلوں کے روابط کی اولیں منزل
وہ زندگی کے نئے دور کی حسیں منزل
اسی محلے کے چھوٹے سے اک مکان کی عطا
مری زمیں کو خداوند آسماں کی عطا
وہی عطا وہی سوغات دیکھنے کے لئے
برس برس کے وہ لمحات دیکھنے کے لئے

دیار پاک سے ہندوستان میں آیا تھا
میں اپنے گھر سے پھر اپنے مکان میں آیا تھا

پھر ان رشتہ داروں اور احباب کا ذکر ہے جن سے ملاقاتیں ہوئیں۔ اس کے بعد مشاعرہ کا ذکر اور اس میں مختلف مذاہب اور عقیدوں کے لوگوں کی شرکت، انسانیت

(HUMANISM) پہ یقین اور اختلافات پر تعجب کا اظہار ہے۔

یہ کائنات ہے کیا، مظہر محبت ہے
اور آدمی کی محبت ہی اک عبادت ہے
تو پھر یہ جنگ و جدل کیوں ہے نفرتیں کیوں ہیں؟
خدا کے بندوں میں ایسی خباثتیں کیوں ہیں؟

شاعر کا جواب ہم کیا دے سکیں گے لیکن اس کا جواب قرآن کریم میں اس صورت میں ملتا ہے۔

لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم
ثم رددنٰہ اسفل السافلین (سورۃ والتین آیت ۴،۵)

لیکن شاعر کا سوال درست ہے کیوں کہ خدا نے خود کہا ہے کہ

لیس للانسان الا ما سعیٰ

اور شاعر کا پیغام محبت۔

برا ہے کیا جو رہیں ہم پڑوسیوں کی طرح
خدا کے سائے میں سب لوگ بھائیوں کی طرح
وہی زمین ہے وہی آسمان ہے ہم بھی وہی
"رحیم و رام" کا صدیوں سے ہے کرم بھی وہی

لیکن "رحیم و رام" کی تاریخ اور حقیقت پر غور کرتا تو شاید شاعر ان کو اکٹھا نہ کرتا۔ اگر "رحیم" کے معنی اللہ ہیں تو اس کا مترادف کسی حد تک ہندو مذہب میں "ایشور" ہو سکتا تھا لیکن راجہ دسرتھ کے بیٹے "رام" ہندو مذہب کے مطابق بھی اوتار کا درجہ رکھتے تھے۔ ایشور کا نہیں۔ رام اور رحیم کی تاریخ یہ ہے کہ یہ تحریک آزادی کے زمانے میں مہاتما گاندھی کی مصلحتانہ کوشش یا تقسیم سے ہندوستان کو بچانے کے لیے نعرے کے طور پر اس طرح ادا کیا جاتا تھا۔

"چاہے رام کہو یا رحیم کہو   دونوں کی غرض اللہ سے ہے"

ظاہر ہے مسلمانوں پر اس کا اثر ہوا۔ بہر کیف شاعر کا مطلب تو خوشگوار ہے اس کے لیے تجنیس حرفی (ALLITERATION) کی شعری ضرورت کے تحت تکنیکی غلطی کو نظرانداز کیا جا سکتا ہے۔

پھر شاعر کے اپنے آبائی شہر اورنگ آباد جانے کا قصہ جب شاعر کے خسر اور والد کی وفات ہو چکی تھی اور جذبات سے مملو ہر اس فرد کی ترجمانی جو اپنا آبائی وطن چھوڑ کر پاکستان کو مسکن بنانے کے لئے آیا تھا۔

یہ شہر جس کو سب اورنگ آباد کہتے ہیں
یہاں پہ صدیوں سے میرے بزرگ رہتے ہیں
یہ شہر، یہ مرے خواب و خیال کا درپن
یہ شہر، اس میں ہے اب بھی کہیں مرا بچپن
یہ شہر، میری محبت کا راز دار بھی ہے
یہ شہر، میری غریبی کا پردہ دار بھی ہے
یہ شہر، مجھ پہ ہیں اس شہر کے بہت احسان
کہ میری ماں، میرے ابا کی قبر بھی ہے یہاں
تمام بھائیوں بہنوں میں تھا میں سب سے بڑا
(اور اب ملا بھی تو پچیس سال بعد ملا)

وہ سب تھے میرے مگر کوئی بھی نہ تھا میرا
عجیب طرح کی بیگانگی کا تھا ڈیرا

پھر اس شہر کی یاد جسے شاعر کی نوجوانی کا پہلا عشق اور پہلی معصومانہ دست درازی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ شعوری رو میں کہے گئے چند اشعار کے نمونے

وہ ہم سنوں میں سبھی سے تھی مختلف لڑکی
ہو جیسے رسم و روایت سے منحرف لڑکی
نہ جانے تھا اسے خود پر کوئی غرور کہ ناز
نجانے کیوں مجھے اچھا لگے تھا یہ انداز

وہ ایک رات کہ وہ بھی تھی پورے چاند کی رات
وہ سو رہی تھی کسی بے خبر ادا کے ساتھ

وہیں اندھیرے میں بیٹھا میں اس کو تکتا تھا
مرے وجود پہ طاری عجیب سکتا تھا
کہ میں نے دیکھا کوئی زلف رخ پہ آئی ہوئی
ہو جیسے چاند پہ بدلی سی کوئی چھائی ہوئی
میں بے خیالی میں وہ زلف جب ہٹانے لگا
دھڑک اٹھا مرا دل، ہاتھ تھرتھرانے لگا
وہ ہڑ بڑا کے اٹھی چیخنے ہی والی تھی
کہ ہاتھ جوڑ کے میں نے معافی چاہی تھی

میں کیا بتاؤں کہ کب تک رہا میں شرمندہ
کہ زندہ ہو کے بھی گویا نہیں تھا میں زندہ

تو پھر خدا ہی کو کچھ رحم آگیا مجھ پر
اور اس کا سایۂ رحمت سا چھا گیا مجھ پر
اسے بنا دیا میرے لئے میرے رب نے
''رفیق'' چن لیا اس کے لئے مجھے سب نے

اس کے بعد اور اشعار، ماں کی یاد، باپ کی دعاؤں کی یاد، لوگوں کی یاد جو آشوب روز گار سے تتر بتر ہو گئے تھے۔ عشق و محبت کی ابتدائی خوبصورت کہانی اور یادرفتگاں کے بعد پھر پاکستان کی سیاست، ضیا کا دور حکومت، اس کے بعد عرب ممالک کا بیان جہاں دولت اور امارت نے لوگوں کو مغرب کے قریب کر دیا تھا۔ لیکن اس کے بعد نظریات کے سائے میں پلا ہوا ایک مشاہدہ۔

خدا کے گھر سے بھی اونچا تھا بادشاہ کا محل
اور اس کے پاس تھے کعبے سے بھی بڑے ہوٹل

یہاں بھی ایک ٹیکنیکی غلطی نظر آتی ہے۔ کعبہ نشیب میں واقع ہے۔ شاید مکہ کی سب سے نیچی جگہ جہاں پہاڑوں اور چٹانوں سے ڈھل کر آتے ہوئے پانی چاہ زم زم کی شکل میں حضرت ہاجرہ کو نظر

آئے تھے۔ کعبہ اپنی اونچائی اور تکمیل ساخت میں شاہی محل سے نہیں بلکہ آس پاس کے مکانوں سے بھی نیچا ہے۔ اور اس کعبہ میں اسلام سے قبل بھی اس مالک کی عبادت ہوتی تھی جو عرش نشیں ہے اور اس کی وجہ یہ ہے سب سے اونچا ہے اور اونچا رہے گا تاریخ کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ کے حکم سے یہیں عبادت گاہ بنائی تھی کیونکہ یہیں دنیا کی سب سے اہم ضرورت پانی کی تلاش میں حضرت ہاجرہ پہنچی تھیں اور مقیم تھیں۔ کعبہ کا ذکر کر کے غیر ساری شہنشاہیت یا بادشاہت اور سرمایہ دارانہ نظام کی بات کی جائے تو اکثر متمول لوگوں کے مکانات نئی عبادت گاہوں سے اونچے ملیں گے چاہے وہ مغرب ہو یا مشرق لیکن مکانات کا عبادت گاہوں سے اونچا ہونا کسی الوہی فرمان سے انحراف نہیں ہے اور پھر چند خوبصورت اشعار۔

جناب صدر نے دستور میں کی اک ترمیم
اٹھایا اپنا عصا اور لگائی "ضرب کلیم"
ہر ایک ضرب پہ ان کو گمان ہوتا تھا
کہ "سامری" رہا باقی نہ اس کا "گوسالہ"
مگر وہ دانہ کہ جو زیر دام باقی تھا
گواہ تھا کہ ابھی "سحر سامری" باقی تھا

مندرجہ بالا انتخاب کا آخری شعر فنی اعتبار سے تلمیح کے ساتھ ساتھ علامتی اظہار کی خوبصورت مثال ہے۔ اس کے بعد صدر ضیاء کے نام نہاد اسلامی نظام اور طریقہ کار کا عکس۔

جو دفتروں میں ادا اک نماز ہوتی تھی
وہ اک سیاست اہل نیاز ہوتی تھی
تمام فرقوں میں رسہ کشی سی جاری تھی
بنام شرع حکومت کی پاسداری تھی
وطن کی جو بھی تھی حالت وہ دیدنی تھی بہت
جو گفتنی نہ تھی وہ بات گفتنی تھی بہت

اس کے بعد تڑپتے ہوئے دل کی صدا بالخصوص ہر دکھ کا ناتا اپنا اور اپنے جیسے افراد کا بلکہ مجموعی طور پر ایک امت کا مطالبہ ہے۔ کچھ اعتراف کچھ شکوہ ملاحظہ ہو۔

حضور آپ کی امت کا ایک فرد (۱) ہوں میں
مگر خود اپنی نگاہوں میں آج گرد ہوں میں
عجیب ذوق سفر ہے کہ صورت پرکار
جو اپنے گرد ہی گھومے وہ رہ نورد ہوں میں
دہائیوں سے نچوڑا تھا جس اکائی کو
اب اس اکائی سے آمادۂ نبرد ہوں میں (۲)
میں اپنی ذات میں ہوں اپنی قوم کی تصویر
کہ بے عمل ہی نہیں جہل میں بھی فرد ہوں میں

میں اپنی ذات میں کس طرح ایک عالم ہوں
سمجھ سکی نہ کبھی میری فکر کم مایہ
مرا وجود ہے سنگ مزار کے مانند
کہ میرے ساتھ مری روح کیا بدن بھی نہیں
کہا گیا جسے قرآں میں بندۂ مومن
وہ میں تو کیا کہ مرا کوئی ہم وطن بھی نہیں
ہر امتی کی یہ فرد عمل ہے کیا کیجئے
حضور آپ ہی ہم سب کا فیصلہ کیجئے

اس کے بعد مشاعروں کے سلسلے میں مختلف ممالک کا سفر اور شاعر کے مشاہدے اور تجربہ کا ذکر۔ کینیا، جنوبی افریقہ، منڈیلا کی تحریک آزادی کا ذکر اور جنوبی افریقہ میں قیام کے دوران ایک افریقن لڑکی کا ذکر جو ماں کی جانب سے ہندوستانی تھی۔

وہ شاعرہ بھی تھی، بھرپور ایک عورت بھی
لگے کہ مجھ سے تھی کچھ خاص اس کو رغبت بھی

---

(۱) فرد مونث ہے۔ مذکر استعمال غلط العام ہو گیا ہے لیکن عام کا اطلاق ''آئینہ در آئینہ'' کے خالق پہ نہیں ہو سکتا (ادارہ)

(۲) شعر معنویت کی تہیں لئے ہوئے ہے اور بحیثیت ایک شعر کے سمبل اور تجرید کا نمونہ ہے جسے حقیقت نگاری اور عوامی ادب میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ (ادارہ)

غزل دکھائے وہ راغب کو مجھ سے بات کرے
اسی بہانے مرے ساتھ دن کو رات کرے
وہ مسکرائے تو موتی بکھر بکھر جائیں
عجیب آنکھیں تھیں دیکھیں تو سحر کر جائیں
بدن ، وہ ترشا ہوا بت سیاہ پتھر کا
وہ زلف حلقہ بہ حلقہ وہ جال گھونگھر کا
یہ دل اسیر بھی ہو اور رہائی بھی چاہے
مگر گرفت میں رہنے کا خوف بھی گاہے

سو میں نے ایک قرینے سے دل کی بات کہی
جو بات کہنا تھی مجھ کو بہ احتیاط کہی

یہ دل کی بات ہے دل میں رہے تو اچھا ہے
نظر کی بات نظر ہی کہے تو اچھا ہے
یہ حادثہ بھی ہوا شکر ہے کہ ٹل بھی گیا
میں گر رہا تھا مگر آپ ہی سنبھل بھی گیا

اس کے بعد ایک اور معاشقۂ بے عمل

تھا ایک دن مرا لکچر غزل کے بارے میں
کہی جو میں نے کوئی بات استعارے میں
تو میں نے دیکھا کہ لڑکی وہ مسکرانے لگی
(لگا کہ ضبط کی طاقت کو آزمانے لگی)
وہ کاریڈور میں جلسے کے بعد مجھ سے ملی
نظر ملی تو لبوں پر پھر اک کلی سی کھلی
مگر وہ آنکھیں !(وہ ان پر نہ رکھ سکی قابو)
تڑپ کے پلکوں تک آ کے ڈھلک پڑے آنسو

جہاں جہاں بھی گیا میں وہ اشک ساتھ رہے
نگاہ و دل میں یہ قید تعینات رہے

جزیرہ ماریشس کا ذکر جہاں ہندو مسلم اور عیسائی کلچرل ایکسچینج نے شاعر کو بہت متاثر کیا ۔

وہاں ہیں دیر و حرم بھی مگر ہیں دونوں ساتھ
رحیم و رام ہیں گویا خدا کے دونوں ہاتھ
وہ عید ہو کہ دوالی مناتے ہیں دونوں
بسنت رت میں پتنگیں اڑاتے ہیں دونوں
دوئی اکائی میں تبدیل ہو رہی ہے وہاں
نئے سماج کی تشکیل ہو رہی ہے وہاں

اور پھر ناروے اور سویڈن کے سفر کا ذکر اس کے بعد پاکستان اور کراچی کا المیہ اور وطن میں بدامنی اور مایوسی کا نوحہ ۔

کہیں پہ کھیلیں مسلمان خوں کی ہولی
کہیں پہ چوریاں ڈاکے تو لوٹ مار کہیں
پولس کے ہوتے کسی کو نہ تھا قرار کہیں
پڑوسیوں سے پڑوسی کو خوف آنے لگا
خود اپنا سایہ ہی انسان کو ڈرانے لگا

اور اس بدامنی اور قطع رحمی کی بنیاد پر مایوس کن مستقبل کا المیہ

اور اب وہ وقت آئے گا کہ ساری قوم روئے گی
اور اپنے دل کے داغ اپنے آنسوؤں سے دھوئے گی

یہ سرزمیں پاک ہے کہ ارض کربلا ہے یہ
یہ لوٹ مار، قتل و خوں، ڈکیتیاں، تباہیاں
بموں کی زد پہ ہنستی، گاتی، جگمگاتی بستیاں
بہشت میں کہاں سے اک جہنم آ گیا ہے یہ

اور قوم میں نفرت، مخاصمت، تعصب، بے حسی جو صدی کے آخر تک جاری تھی جب یہ نظم

اپنے بیٹے، بیٹیوں اور خاندان کے دیگر افراد کے لئے دعائیہ کلمات پر اور اپنے بچوں کے لئے باہمی محبت کی نصیحت پر ختم ہوتی ہے۔

آئینہ در آئینہ کی ساخت پر غور کیا جائے تو اس میں پیدائش، بچپن، عشق، بغاوت، محبت، محنت، رقابت، شہرت سب شامل ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ یہ پاکستان کے پچاس سالہ دور کے سیاسی اور معاشرتی عوامل کا مشاہدہ ہے جس میں بہت سے تاثرات اور آراء متنازع ہو سکتی ہیں مگر شاعر کے خلوص اور کرب پر شبہ نہیں کیا جا سکتا جو اس کے نامساعد سیاسی حالات کے تجزیہ سے عیاں ہے۔ ایک بات اور قابل ذکر ہے کہ شاعر اپنے ترقی پسندانہ نظریات پر شروع سے آخر تک قائم نظر آتا ہے لیکن کہیں کہیں رد تشکیل یا ڈی کنسٹرکشن کا عمل حالات کے ریشنلائزیشن میں ظاہر ہوتا ہے۔ بنیادی طور پر تمام مشاہدات اور تبصرات شاعر کے نظریہ اور یقین پر مبنی ہیں لیکن مولانا حالی کی بات بھی یاد آتی ہے جو انہوں نے مرزا غالب کے عقاید کے سلسلے میں لکھی ہے۔

''اگرچہ شاعر کے کلام سے اس کے عقاید پر استدلال نہیں ہو سکتا مگر جو بات دل سے نکلتی ہے وہ چھپی نہیں رہتی.....''

اس بنیاد پر ملک کے سیاسی حالات، زبان، ثقافتی پہچان، مذہبی عناصر اور اس کی ضد سیکولرزم پر جو بات کہی ہے وہ شاعر کا مشاہدہ تھا۔ اظہار خیال میں کوئی ایسی بات نظر نہیں آتی جو پاکستان اور اسلام کی محبت سے متصادم ہو۔ اپنے پروگریسیو نظریہ پر مبنی شاعر نے بہت سے تجربات کئے جن کو اس کی رائے کہا جا سکتا ہے اور جن سے اختلاف کیا جا سکتا ہے مگر آزادی رائے تو ہر انسان کا حق ہے۔ اور ایک ادیب اور شاعر تو بغیر اس آزادی اور بقول سارتر کچھ نہیں تو بغیر ''NO'' کہنے کی آزادی کے زندہ نہیں رہ سکتا۔ ویسے بھی ان کے مشاہدات یا نظریات اس عظیم تاریخی کارنامہ پر اثر انداز نہیں ہو سکتے جو اس نے ''آئینہ در آئینہ'' جیسی طویل نظم لکھ کر سرانجام دیا۔ بے شک اس نظم میں خالص بیانیہ عنصر بھی ملیں گے مگر اس کو ''ادبی صحافت'' نہیں کہا جا سکتا۔ اس کا جواز ہمیں روسی ہیئت پسندوں کے یہاں ملتا ہے۔ انہوں نے کہا تھا کہ یہ بات اہم نہیں کہ کیا کہا گیا بلکہ یہ کہ کیسے کہا گیا۔ اور کس آسانی سے سمجھ میں آ گیا، پر زور ہوتا ہے۔ شاعری میں ہزار حقیقت نگاری پر یقین رکھنے کے باوجود یہ ممکن نہیں۔ ابہام، تجرید، یا کثیر المعنویت نہ بھی آئیں تو تمثیل (ALLEGORY) جو علامت ہی کی ایک شکل ہے، جمالیاتی اظہار اور بدیعات سے فرار ممکن نہیں۔

اس طویل پابند نظم میں دو ایک جگہ کمپوزنگ کی غلطیاں نظر آئیں جن کو غلط نامہ میں شامل کرنا بہتر تھا
صفحہ:۹۳۔ عجیب لوگ ہیں ہم بھی نصیب کے بیٹے (قافیہ)

فلک کو سر پہ اٹھائے زمین کے بیٹے

صفحہ ۲۵۲: ''بوزری'' اپنی منزل یا زرگری (وزن)

آئینہ در آئینہ میں شروع میں تخلیق کار کی حالیہ تصویر اور آخر میں جوانی کی تصویر زبان بے زبانی سے انسانی زندگی کی علامت کو ظاہر کرتی ہیں۔ شاعر کی جوانی کی تصویر دیکھ کر خیال آتا ہے کہ انہوں نے ''یادوں کی بارات'' میں جناب جوش مرحوم کی عشقیہ وارداتوں کے قصوں کی طرح اپنی سوانح کو رنگین نہیں بنایا لیکن بہت سی ان کہی ضرور چھوڑی ہے

۴۰۰ صفحات کی یہ کتاب ''آئینہ در آئینہ'' دنیائے ادب ریگل ٹریڈ اسکوائر ریگل چوک کراچی سے شائع ہوئی۔

فون نمبر ۷۷۶۱۳۲۲۔ ای میل DUNYA - E - ADAB @ YAHOO.COM

قیمت: ۲۰۰ روپے (مجلد) اور بغیر جلد ۱۰۰ روپے

کتاب کا انتساب پاکستان کی نئی نسل کے نام ہے اور یہ کتاب یقیناً نئی نسل کے لئے ایک بیش بہا تحفہ ہے۔ اس میں تخلیق کار کے نظریہ کے مطابق تصوراتی روشن مستقبل کی نوید اور آسیت نہیں ہے بلکہ وجودی کرب اور یاسیت ہے۔ جدیدیت اور تجریدیت سے بیزاری کے اظہار کے باوجود آئینہ در آئینہ جدید اور معتبر تخلیق ہے۔

واللہ ولی التوفیق

(نوٹ)

ماہنامہ ''صریر'' میں لکھنے والے صاحب کے نام کی بجائے صرف ''ادارہ'' لکھا گیا ہے ''ادارہ صریر'' میں بحیثیت ایڈیٹر محترم ڈاکٹر فہیم اعظمی کے علاوہ کسی کا نام نہیں ہوتا اس لئے گمان غالب ہے کہ یہ تفصیلی تجزیاتی مطالعہ موصوف ہی کا نتیجہ فکر ہے (مرتب)

حمایت علی شاعر

''آئینہ در آئینہ'' کے سلسلے میں

بھائی فہیم آعظمی صاحب

سلام مسنون

پہلے تو میں آپ کو ''رائدین جدیدیت'' کی اشاعت پر مبارک باد دیتا ہوں۔ اس کتاب کے مطالعے سے ''جدیدیت'' کے بارے میں آپ کے نقطۂ نظر کی وسعت کا اندازہ ہوا۔ یہ مضامین ''صریر'' میں بھی میری نظر سے گزرتے رہے مگر کبھی کوئی مضمون مطالعے سے رہ بھی گیا ''جدیدیت'' اصطلاحی طور پر جس طرز فکر سے عبارت ہو کر رہ گئی ہے اس کے بارے میں مجھے کچھ اختلافات ہیں جن کا میں نے مختصر طور پر اظہار اپنی منظوم خودنوشت سوانح حیات ''آئینہ در آئینہ'' میں بھی کیا ہے لیکن آپ جس ''جدیدیت'' کے قائل ہیں، میرے خیال میں اس سے اختلاف ممکن نہیں۔ اس انداز فکر کو تو ہم ''ترقی پسندی'' کی توسیع کہتے ہیں۔ آپ نے ''آئینہ در آئینہ'' کے مطالعے کے دوران جہاں جہاں بھی مجھ پر فقرہ چست کیا ہے، مجھے لطف آیا۔ اور ایک ''جدیدیت پسند شاعر'' کے جو اشعار ثبوت کے طور پیش کئے، وہ ہمارے ہی قبیلے کے آدمی نظر آئے۔ ان کے اشعار میں کہیں ابہام نہیں، استعارے بھی قابل فہم ہیں اور علامتیں بھی ..... اور پھر سب سے بڑی بات ''موضوع'' ..... اصطلاحی جدیدیت میں تو ''خارجی حقیقت'' شجر ممنوعہ سمجھی جاتی ہے ترقی پسند ادب کے بعض کمزور پہلوؤں کے ردعمل میں ''طاقت ور شاعری'' کے طور پر جو تخلیقات جدیدیت پسندوں نے پیش کی ہیں، وہ تہہ داری کے شوق میں اتنی زمین دوز ہو گئیں یا اپنے اظہار

میں اتنی الجھ گئیں کہ خود شعراء کے لیے ناقابل فہم ہو گئیں۔ یہی حال افسانے کا ہوا۔ بے ربط علامتوں کے ہجوم میں کہانی کھو گئی۔ کردار بے چہرہ ہو گئے۔

''جدیدیت'' سے ہمیں یہی اختلاف ہے ورنہ اردو کے جن شعراء کے نام آپ نے ''رائدین جدیدیت'' کے طور پر چنے ہیں ..... دو ایک کو چھوڑ کر وہی ہمارے بھی رہنما ہیں۔ دراصل ترقی پسندی کا زندگی سے ایک ''نظریاتی تعلق'' بھی ہوتا ہے۔ یہی ''اختلاف'' کی بنیاد ہے۔ اختلاف بُری چیز نہیں۔ اس سے فکر کی راہیں کھلتی ہیں (خیر یہ الگ بحث ہے)

آپ نے میری آپ بیتی کو مجموعی طور پر سراہا ہے اور ''صریر'' کے (۲۲) صفحات پر محیط ایک فکر انگیز تبصرہ لکھ کر میرے ذہن میں بھی روشنی کے کچھ دریچے کھول دیے ہیں

چند باتیں مجھے بھی عرض کرنی ہیں۔ مہاجرین کے بارے میں آپ نے لکھا ہے۔

''گمان ہوتا ہے کہ شاعر کو ہجرت کر کے پاکستان آنے والوں اور پھر یہاں اپنا دکھڑا سنانے والوں سے ہمدردی نہیں تھی''

ثبوت میں آپ نے وہ اشعار دیے جو میں نے ''مہاجرین'' کے ایک خاص طبقے کی نمائندگی کے سلسلے میں لکھے تھے۔ کاش آپ کی نظر میں یہ اشعار بھی ہوتے۔

مگر تھے سیکڑوں ایسے بھی جو بفضل خدا
نگاہ و فکر میں کردار میں تھے سب سے جدا
جو اس وطن کو خدا کی عطا سمجھتے تھے
جو اس زمین کو عرش علا سمجھتے تھے
وہ خاک ہو گئے لیکن کسی سے کچھ نہ لیا
جو اپنے پاس تھا وہ بھی وطن کی نذر کیا

آپ نے لکھا کہ ''جس جرنلائزیشن سے اس کا ذکر کیا گیا، وہ درست نہیں'' یقیناً درست نہ ہوتا اگر میں ایسے شعر نہ لکھتا۔

غرض یہ اور ہی طبقہ تھا اور ہی مخلوق
کہ اُن کے اور ہی عاشق تھے اور ہی معشوق
وہ زر طلب بھی تھے، دین مبیں کے حامی بھی
برستا رہتا تھا خاص ان پہ ''فضل ربی'' بھی

میں ایک بات اور بھی کہنا چاہتا ہوں۔ ہم لوگ خود کو لاکھ ''مہاجرین'' کہیں مگر یہ درست نہیں ہے ہم ''تارکین وطن'' ہیں۔ ہجر میں ''وصل'' کی آرزو پوشیدہ ہوتی ہے۔ ''فتح مکہ'' اس کی دلیل ہے۔ ہماری ہجرت میں ''واپسی'' کا کوئی تصور نہیں۔ ہم نے پاکستان آ کر اپنے تمام خونی اور تاریخی رشتے ختم کر دیے۔ اس جدائی میں جو دلوں پر گزری وہ ایک فطری عمل ہے۔ دوسری بات یہ کہ یہ ''ترک وطن'' بیشتر لوگوں نے اپنی مرضی سے کیا (ملازمتوں کے ٹرانسفر کی مثال سامنے ہے) رہی وہ نفرتیں اور تعصّبات جو ''تقسیم کے نتیجے'' میں نمایاں ہوئے، جو خون خرابہ ہوا، وہ ''دونوں قوموں کا'' مقدر تھا۔ ہندوستانی مسلمان آج بھی اسی دور سے گزر رہے ہیں۔

آپ نے راولپنڈی سازش کے سلسلے میں بھی ایک انکشاف کیا ہے ''یہ اشتراکیوں کی سازش تھی جس میں اس زمانے کے روس کا بھی حصہ تھا'' ممکن ہے آپ کا گمان درست ہو لیکن اگر یہ حقیقت ہوتی تو اس کا اظہار سرِ عام ہوتا اور ملزمان کو صرف چار چار سال کی سزا نہ سنائی جاتی۔ آپ بھی جانتے ہیں کہ ملک سے غداری کی سزا موت ہوتی ہے اس کیس میں ''فوجی افسروں'' کو بھی موت کی سزا نہیں دی گئی۔ اسی زمانے میں فیض صاحب کا یہ شعر بھی بہت مشہور ہوا تھا۔

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہیں
وہ بات اُن کو بہت ناگوار گزری ہے

میں نے بھی اس شعر کا حوالہ دیا ہے

بقول فیض انہیں ''اس بات'' پر ہوئی تھی سزا
وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا

اور پھر فیض صاحب کا یہ شعر بھی غور طلب ہے۔

بنے ہیں اہل ہوس ، مدعی بھی ، منصف بھی
کسے وکیل کریں ، کس سے منصفی چاہیں

میں نے ادبی حوالے سے فیض اور سجاد ظہیر کی مقبولیت کی بات لکھی تھی۔ اس کا ثبوت ان کی جیل میں لکھی ہوئی کتابوں سے ملتا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ فیض صاحب کی کتابیں ''دست صبا'' اور ''زنداں نامہ'' اور ان بیگم ایلس فیض کے نام ، ان کے خطوط ''صلیبیں مرے دریچے میں'' اپنے دور کی مقبول ترین کتابیں تھیں۔ سجاد ظہیر (بنّے بھائی) کے اپنی بیوی کے نام لکھے ہوئے خطوط ''نقوش زنداں'' میں بہت ذوق وشوق سے پڑھے گئے۔ اس کے علاوہ ''ذکر حافظ'' اور ''روشنائی'' بھی ..... ممکن ہے آپ کو اس سے اختلافات ہو مگر یہ دونوں بزرگ اپنے دور کے محبوب ترین اہل قلم میں شمار ہوتے تھے اور آج بھی ہیں۔

ریڈیو میں ملازمت کے حوالے سے آپ نے مجھ پر جو چوٹ کی ہے۔ اس کا بھی میں نے لطف لیا۔ آپ نے خود میرا یہ شعر کوٹ کیا ہے۔

سو میں نے صبر کیا اور نوکری کر لی
قلم یہ جبر کیا اور نوکری کر لی

یہ سانحہ کس کے ساتھ پیش نہیں آیا؟ تفصیل میں کیا جاؤں ..... جاننے والے جانتے ہیں۔ پھر بھی بقول مصطفےٰ زیدی۔

بس ایک ہم تھے جو تھوڑا سا سر اٹھا کے چلے
اسی روش پہ ، رقیبوں کے واقعات تو دیکھ

مجھے تو اعتراف ہے۔ بقول غالب۔

مارا زمانے نے اسداللہ خاں تمہیں

مگر خدا کا شکر ہے کہ میں نے صرف قلم پر ہی جبر کیا اور چپ رہا۔ غالب جیسا آزاد خیال اور خود پرست شاعر جب یہ کہہ جاتا ہے کہ۔

غالب ، وظیفہ خوار ہو ، دو شاہ کو دعا
وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

تو بھائی، ہم آپ کس شمار میں ..... پھر بھی ہم اپنے انداز میں، اپنی بساط بھر اپنی بات لکھتے ہی رہے۔

شاعر ادب کے محتسبوں کو خبر نہیں
کیا کام لے رہے ہیں تغزل کے فن سے ہم

اور آپ نے بھی اس کی تصدیق کی ہے۔

''شاعر اپنے ترقی پسند نظریات پر شروع سے آخر تک قائم نظر آتا ہے''

''سویلین چیف مارشل ایڈمنسٹریٹر'' کے جبر کے حوالے سے آپ نے مجھ پر بھی ایک اعتراض کیا ہے ''جس نے اخبارات اور حقیقت نگاروں کو خاموش کر دیا۔ اس پر شاعر کیوں خاموش رہا؟'' بھائی فہیم صاحب آپ نے شاید میرا اس دور کا کلام نہیں دیکھا۔ میرا دوسرا مجموعہ کلام ''مٹی کا قرض'' اسی دور میں چھپا تھا یعنی ۱۹۷۴ء میں۔ اس میں بیشتر نظمیں اور غزلیں اس زمانے کی ہیں ''پس دیوار حرف'' اور لمحۂ فکر تو لسانی فسادات اور سندھی مہاجر مسئلہ ہی سے متعلق ہیں۔

کس کو قاتل کہوں، کس کو بسمل کہوں
یہ مرا دوست ہے، وہ مرا بھائی ہے
اپنی تاریخ سے گر اسے پیار ہے
اپنی تہذیب کا وہ بھی شیدائی ہے

بے زبانی کا یہ بھی ہے مارا ہوا
وہ بھی اپنی زباں کا تمنائی ہے

(پس دیوار حرف)

تم بھی فریب خوردہ ہو، ہم بھی تھے بے خبر
دونوں ہی باشعور نہ تھے ، قصہ مختصر

(لمحۂ فکر)

غزلوں کے بیش تر اشعار اسی دور کے حالات کی عکاسی کرتے ہیں۔ کچھ اشعار پیش کردوں۔

اس دور میں جو شخص ہے دستار بہ سر ہے
ہو کوئی تو ، نکلے جو کفن باندھ کے سر سے

یوں دل کی سیاہی میں قلم ڈوب گئے ہیں
تحریر کو نسبت نہ رہی خون جگر سے

وہ قحط جنوں ہے کہ کوئی چاک گریباں
آتا ہے نظر بھی تو گزرتا ہے گماں اور

تو بادباں دریدہ سفینے کا ناخدا
اور قلزم سراب کا میں سند باد تھا

محسوس کر رہا ہوں میں ،کرب شکستگی
تم بھی شگفت گل کی صدا غور سے سنو

ہر رہنمائے قوم ہے رہزن ، ترے سوا
سچ ہے ہر ایک دوست ہے دشمن ، ترے سوا

پوری کتاب ہی ایسے اشعار سے بھری ہوئی ہے۔ میں نے تو استعاروں کنایوں میں اپنی بات کہی، حبیب جالب جس انداز کے شعر کہتے تھے آپ بھی جانتے ہیں۔

لاڑکانے چلو ، ورنہ تھانے چلو

وہ بھی پہلے بھٹو صاحب سے خوش گمان تھا۔ پھر وہ شعر کہے جو وقت کا تقاضہ ہوا۔ بھٹو

صاحب نے جن نعروں کی بنیاد پر مغربی پاکستان میں کامیابی حاصل کی تھی اس کے دھوکے میں اکثر لوگ آ گئے تھے پھر سبھی ان کی سیاست کو سمجھ گئے

دراصل یہ کوئی نئی بات نہیں تھی ۔ ہماری تو پوری ''سیاسی'' تاریخ ہی ''منافقت'' کی تاریخ ہے پاکستان کے بارے میں میرا بھی ایک شعر ہے ۔

نعروں میں گونجتا ہوں تو چپ ہوں کتاب میں
معنی سے بے نیاز میں ''اک لفظ'' ہوں ہنوز

اردو اور علاقائی زبانوں کے باب میں آپ نے لکھا ہے کہ

''اردو پاکستان کی پہچان ہے اور علاقائی زبانیں، علاقوں کی ..... علاقائی زبانوں کو کہیں بھی نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کی گئی ۔ اردو کے ساتھ البتہ زیادتی ہوئی کہ وہ ابھی تک ملک کی سرکاری زبان نہ بن سکی''

یہ اردو کا المیہ ہے ۔ لیکن اردو کو ''قومی زبان'' بنانے کے سلسلے میں کسی علاقے نے کبھی مخالفت نہیں کی ۔ حتی کہ ''مسلم بنگال'' میں بھی لسانی مسئلہ اس وقت اٹھا جب ''بنگالیوں کی اکثریت ہونے کے باوجود'' ان کے صوبے میں ان کا حق نہیں دیا گیا ۔ بنگالی کو ان کے علاقے میں سرکاری زبان نہیں بنایا گیا ۔ اگر وہاں اردو کے ساتھ بنگالی کو بھی اس کا پیدائشی حق دے دیا جاتا تو اردو کی مخالفت نہ ہوتی ۔ وہ خط نسخ اور خط نستعلیق میں مماثلت کے سبب اردو کو بھی ''نبی جی بھاشا'' کہتے تھے اور اس کا عربی کی طرح احترام کرتے تھے ۔

یہی مسئلہ سندھ میں پیش آیا ۔ ایوب خان کے زمانے میں جنرل ٹکا خاں نے ۱۹۵۹ء میں ایک ٹیلی فونک آرڈر پر پورے سندھ کے دفاتر اور مدرسوں میں سندھی پر پابندی عائد کر دی تھی اور کسی کے کان جوں نہیں رینگی ۔

آپ یقیناً جانتے ہوں گے کہ اردو سندھ میں ولی دکنی کے زمانے سے بولی اور لکھی جا رہی ہے ۔ سچل سرمست سے پہلے کے ایک شاعر محمود صابر ٹھٹوی کے دو ایک اردو اشعار ملاحظہ کیجئے ۔

سن ریختہ ولی کا جی خوش ہوا ہے صابر
حقائقِ فکر روشن ، ہے انوری کے مانند

صابر سنا ہوں ، قافیہ سنجانِ ہندسوں
تجھ ریختہ کی دھوم پڑی ہے دکن میں جا

اور آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ ہمارے دور ہیں پیر حسام الدین راشدی سے لے کر شیخ ایاز تک کئی سندھی اہل قلم کی اردو میں بھی کتابیں ہیں۔ شیخ ایاز کا پہلا شعری مجموعہ اردو میں تھا۔ ''بوئے گل نالۂ دل'' جو ۱۹۵۴ء میں آفاق صدیقی نے شائع کیا تھا۔ شاہ بھٹائی کا کلیات ''شاہ جو رسالو'' کا منظوم اردو ترجمہ بھی شیخ ایاز ہی نے کیا تھا (اس میں بھی آفاق کی اعانت شامل تھی)
اردو کی مخالفت اس وقت شدید ہوئی جب ایوب دور کے ''لسانی مارشل لاء'' کے بعد بھٹو کے زمانے میں سندھ اسمبلی نے سندھی زبان کو اپنے صوبے کی ''سرکاری زبان'' بنانے کا بل پاس کیا۔ اور کراچی میں محترم رئیس امروہوی نے ''روزنامہ جنگ'' میں ایک قدیم شاعر کے مشہور مصرعے ۔

عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

کو ''اردو کا جنازہ'' بنا کر شائع کر دیا۔ یہی لسانی فساد کی بنیاد ہے۔ اردو کے ''قومی زبان'' ہونے کے باوجود ''سرکاری زبان'' نہ بنائے جانے پر بھی میں نے ''آئینہ در آئینہ'' میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے ۔

ہماری ''قومی زبان'' گر نہیں ہے سرکاری
تو اس میں اہل سیاست کی ہنر کاری
یہ سوچیئے کہ پس پردہ کون حائل ہے
منافقت کی طرف کس کا ذہن مائل ہے
ہمارے ''سانولے انگریز'' ہیں کہ ''پاکی'' ہیں
کہ اپنے گھوڑوں پہ پاؤں جمائے ''جاکی'' ہیں

یہ لوگ کس لیے اردو سے دور بھاگتے ہیں
چمن میں رہتے ہیں، خوشبو سے دور بھاگتے ہیں
انہیں یہ ڈر ہے کہ اردو عوام کی ہے زباں
اور اس کا رابطہ ہر قومیت سے ہے یکساں
یہ رابطہ کسی وحدت میں ڈھل نہ جائے کہیں
یہ میل جول، محبت میں ڈھل نہ جائے کہیں

لڑاؤ اور حکومت کرو، بنام وطن
یہی رہا ہے ہمیشہ سے حاکموں کا چلن

اور سندھی کے تعلق سے یہ اشعار بھی قابل توجہ ہیں

جو ہوتی سندھ میں سندھی زبان ''سرکاری''
تو اس کا فیض بھی ہوتا عوام میں جاری
جو ہم بھی سیکھ لیں سندھی تو ہرج ہی کیا ہے
زباں تو دل میں اترنے کا سیدھا رستہ ہے
یہاں کے لوگ تو اردو زباں بھی جانتے ہیں

اور اس زبان کو ''قومی زباں'' بھی مانتے ہیں
غلط کہا گیا ''اردو کا یہ جنازہ'' ہے
زباں سچل کی ہے۔ یہ نغمہ ''درازا'' (۱) ہے
فرید و سچل و مہند و فیض ہو کہ ایاز
دیار پاک میں اردو کا سلسلہ ہے دراز

(۱) سچل سرمست کے گاؤں کا نام

جہاں تک ''سویلین مارشل لا ایڈمنسٹریٹر'' کے دور حکومت اور پاکستان کی ''مجموعی سیاست'' کی بات ہے کچھ اشعار میں نے ''مٹی کا قرض'' سے دیے۔ کچھ اس کتاب سے لکھتا ہوں۔

عنائتیں تو بہت سی ہیں ہم پہ اللہ کی
مثال انوکھی تھی اس بار، مارشل لا کی
سویلین نے سنبھالا تھا فوج کا قانون
نیا لفافہ تھا لیکن پرانا تھا مضمون
تمام فوج تھی اب زیردست بھٹو کی
بہت ہی دید کے قابل تھی ''جست'' بھٹو کی

ہماری قوم بھی ہے کتنی سادہ و معصوم
یہ کھیل کیسا تھا! کھیلا ہے کون؟ کیا معلوم
جہاں میں ہوں گے کہیں، ہم سے بھی عجیب سے لوگ
خوش اعتقادی کے مارے ہوئے غریب سے لوگ
سیاستوں کا تماشا نظر کے سامنے تھا
خود اپنی قوم کا لاشہ نظر کے سامنے تھا

اور اپنی قوم کے قاتل کو ہم سمجھ نہ سکے
کہ حق تو حق، کبھی باطل کو ہم سمجھ نہ سکے
نظام زیست کو پرکھا نہ حکمرانوں کو
فقیرو پیر کو سمجھا نہ آستانوں کو
پس معابد و درگاہ جو سیاست ہے
کبھی تو سوچتے ہم، کیا یہی عبادت ہے؟

زمین دار، و ڈیرے کہاں سے آئے ہیں؟
یہ دن دہاڑے اندھیرے کہاں سے آئے ہیں؟
جوان کے پاس ہے دولت، کہاں سے اتری ہے؟
زمیں سے نکلی ہے یا آسماں سے اتری ہے؟
یہ فیض ہے کسی سلطاں کی مدح خوانی کا؟
کہ ہے صلہ یہ فرنگی کی حکمرانی کا؟
اثاثہ جو بھی ہے ان کا، حلال ہے کہ حرام؟
کبھی تو ہم کو بتاتا کوئی فقیہہ و امام؟
جو اقتدار میں آیا ہے، اہل ہے کہ نہیں؟
یہ انتخاب ہمارا ہی جہل ہے کہ نہیں؟

اس ''تاریخی المیے'' پر اس کتاب میں میرے (۳۰۰) اشعار ہیں۔ یعنی جنرل یحییٰ خاں کے اقتدار میں آنے سے بھٹو کی پھانسی تک ..... اسی لیے جھلا کے میں نے اپنے ہی ادب کا جائزہ لیا تھا کہ ادب ''سچ'' کا ترجمان ہوتا ہے۔ میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے ایک ''جدیدیت پسند شاعر'' کی دو نظموں کے اشعار دے کر میرے دل میں امید کی شمع روشن کر دی۔ یہ اور بات کہ آپ نے اس شاعر کا نام نہیں لکھا..... مگر میں سمجھ گیا ہوں۔

کون ''معشوق'' ہے اس پردۂ زنگاری میں؟

جی تو چاہ رہا ہے کہ ''آپ'' ہی کا نام لکھ دوں ..... خدا جانے کیوں آپ نے پردہ داری کی۔ کہیں آپ میرے اس مصرعے کی تائید تو نہیں کر رہے ہیں؟

جدیدیت کا تقاضہ ہے پردہ داری بھی

آپ نے میرے ایک ''رقیب'' کا نام نہ لینے پر جدیدیت کے حوالے سے ایک فقرہ بھی مجھ پر چست کیا ہے۔ خوب ہے۔ مزہ آ گیا۔ شاید ہم دونوں ہی بہت محتاط واقع ہوئے ہیں یا

''خوف زدہ'' ہیں۔لیکن خوف؟ کس بات کا؟

مکہ معظّمہ میں کعبتہ اللہ سے اونچے شاہی محل اور فایواسٹار ہوٹلوں کے بارے میں آپ نے جس ''سادہ دلی'' سے بعض تاریخی حوالے دیے ہیں ..... وہ میرا موضوع ہی نہیں ہے۔ حیرت ہے کہ آپ کو علامہ اقبال کی نظم ''لینن۔خدا کے حضور میں'' کا یہ مصرعہ یاد نہیں آیا۔

گرجوں سے بہت اونچی ہیں بنکوں کی عمارات

کیا علامہ اقبال اس تاریخی حقیقت کو نہیں جانتے تھے جس کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے؟ ''کعبہ کا ذکر کیے بغیر ساری شہنشاہیت بادشاہت اور سرمایہ داری نظام کی بات کی جائے تو اکثر متمول لوگوں کے مکانات کا، فی زمانہ عبادت گاہوں سے اونچا ہونا کسی ''الوہی فرمان'' سے انحراف نہیں''

اس ''سادگی'' پہ کون نہ مر جائے اے خدا

''شاہی محل'' صرف رہائش گاہ کا حوالہ نہیں ہے بھائی، ایک ایسے نظام کی طرف اشارہ ہے جس کے خلاف اسلام نے انقلابی قدم اٹھا کر ''خلافت'' رائج کی تھی جو جمہوریت کی طرف پہلا قدم تھا۔آپ جانتے ہیں کہ امام حسین نے بھی اسی ''غیر اسلامی طرزِ سیاست'' کے خلاف بغاوت کی تھی اور آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ ان کی شہادت کے بعد ''سے تاریخ اسلام'' سیاسی اعتبار سے ایک ''منافقت کی تاریخ'' بنی ہوئی ہے۔خلافت بنوامیہ، خلافت بنوعباس، خلافت عثمانیہ ..... سب بادشاہت کے سلسلے ہیں اور ان بادشاہوں نے اپنے ناموں کے ساتھ ''خلیفہ'' لکھ کر دنیا کی آنکھ میں دھول جھونکی، ''کعبہ سے شاہی محل کی اونچائی'' میں یہ ساری تاریخ اور یہ سب شرمناک حقیقتیں پوشیدہ ہیں۔

اسی طرح ''رام اور رحیم'' کے جس واقعاتی پس منظر کا حوالہ دے کر آپ نے گاندھی جی کا ذکر کیا ہے ..... مجھے اس سے غرض نہیں ..... میں تو صوفیائے کرام کی تعلیمات کے تحت مختلف مذاہب کے ایک ''مشترک معاشرے'' کا آئینہ دکھانا چاہتا تھا۔ ہندوستان میں آج بھی اس کی شدید ضرورت ہے۔

اب ایک چھوٹی سے بات ..... ایک چھوٹی سی غلط فہمی بھی دور کر دوں۔

جنوبی افریقہ کے جس ''معاشقے'' کی مثال آپ نے دی، وہ محض ایک لحاتی واقعہ ہے اور جسے دوسرا معاشقہ قرار دیا ..... وہ پہلے ہی واقعے کا کلائمکس ہے۔ ڈربن یونیورسٹی میں میرے لیکچر کے بعد وہی لڑکی مجھے دوبارہ ملی تھی۔ اسی کے آنسوؤں کے حوالے سے میں نے یہ شعر لکھا تھا۔

جہاں جہاں بھی گیا میں، وہ اشک ساتھ رہے
نگاہ و دل میں بہ قید تعینات رہے

آخر میں کمپوزنگ کی جن دو غلطیوں کی آپ نے نشان دہی کی ہے۔ اس میں ایک لفظ ''ہیئے'' ہے جو ''بیئے'' کا قافیہ ہے (اتفاق سے آپ دیکھ نہ سکے) اور جو مصرعہ وزن سے گر گیا۔ اس میں ایک حرف ''ہے'' چھوٹ گیا۔

بوزری اپنی منزل ہے یا زرگری؟

(ویسے اس کتاب میں کمپوزیشن کی بڑی غلطیاں ہیں جس پر مجھے شرمندگی ہے۔ انشاء اللہ دوسرے ایڈیشن میں ایسی غلطیاں نہیں ہوں گی جو پریس میں ہے)

ان تمام ''اعتراضات اور اضافی نوٹس'' کے باوجود ..... میں شکر گزار ہوں کہ آپ نے اپنے تنقیدی مطالعے میں جس وسیع الخیالی اور کشادلی کا ثبوت دیا وہ آپ ہی جیسے ایک صاحب علم اہل قلم سے ممکن تھا۔ آپ نے نظریاتی اختلاف کے باوجود بہت متوازن انداز میں اس سوانح کا تجزیہ کیا اور اپنی رائے قائم کی اور جو خوبیاں نظر آئیں انہیں کھلے دل سے سراہا۔ یہی ایک اچھے نقاد، بڑے ادیب اور ایک سنجیدہ ادبی رسالے کے مدیر کا فرض ہے۔

ورنہ ہمارے عہد میں جو روایت عام ہو چلی ہے وہ ہم سب جانتے ہیں۔ ایک ہی شہر میں رہتے ہوئے دانستہ چشم پوشی کی جاتی ہے۔ در پردہ دشمنی برتی جاتی ہے اور ایسی ایسی غلط فہمیاں پھیلائی جاتی ہیں کہ توبہ! اس نظم کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا ہے۔ جو لوگ دور ہیں ان سے کیا گلہ..... اُن کے لیے ہم ''آنکھ اوجھل، پہاڑ اوجھل'' کے مصداق ہیں۔ پھر بھی آپ جیسے کچھ ''اہل نظر'' وہاں

بھی ہیں جو دور رہ کر بھی ادب کی معرفت قریب ہوتے ہیں اور دوسروں کو اپنے قریب رکھتے ہیں۔

ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

اگر آپ مناسب سمجھیں تو میرے اس خط نما مضمون کو بھی ''صریر'' میں شائع کر دیجے۔ ممکن ہے مجھے کچھ اور روشنی حاصل کرنے کا موقع مل جائے میں ایک بار پھر آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

بارہ سو صفحات پر مشتمل

اردو کے منفرد عالمی شہرت یافتہ رسالہ

دنیائے ادب

کا

جمیل الدین عالی نمبر

(شائع ہو گیا ہے)

(مرتب)

(اوجِ کمال۔ رعنا اقبال)

قیمت: سات سو روپے

624۔ریگل ٹریڈ اسکوائر، ریگل چوک، صدر کراچی

آئینہ در آئینہ..........عکس شاعر

(رعنا اقبال)

جناب حمایت علی شاعر کی منظوم خودنوشت سوانح حیات ''آئینہ در آئینہ'' ماہنامہ ''افکار'' میں پانچ سال تک مسلسل قسط وار شائع ہوئی اور اس نظم کے حوالے سے ''افکار'' ہی میں وقتاً فوقتاً مختلف اہلِ قلم کے تاثرات بھی شائع ہوتے رہے۔ راقم الحروف نے ''آئینہ در آئینہ'' کی تقریبِ رونمائی (منعقدہ 6 فروری 02ء۔ آرٹس کونسل کراچی) میں ایک مضمون پیش کیا تھا۔ اس یادگار تقریب کی صدارت جناب ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے فرمائی تھی۔ اظہارِ خیال کرنے والوں میں ڈاکٹر محمد علی صدیقی' پروفیسر سحر انصاری' پروفیسر این ڈی خان' ڈاکٹر پیرزادہ قاسم' محترم راغب مرادآبادی' اور جاذب قریشی صاحب شامل تھے۔ میں نے حمایت صاحب سے مشورے کے بعد اپنا یہ مضمون ماہنامہ ''افکار'' میں اشاعت کیلئے بھیج دیا لیکن نامعلوم وجوہ کی بناء پر اس مضمون کو ''افکار'' میں شامل نہیں کیا گیا جس کا نہ صرف مجھے بلکہ حمایت صاحب کو بھی بہت دکھ ہے۔

واضح رہے کہ صہبا لکھنوی صاحب کی وفات کے بعد اب افکار نئی انتظامیہ کے تحت شائع ہو رہا ہے' جس کے (پہلا شمارہ جون 02) مدیر ڈاکٹر حنیف فوق ہیں' مدیر منتظم مقصودہ صبا' مدیرانِ اعزازی امینہ صہبا اور غوثیہ صہبا (صہبا لکھنوی مرحوم کی صاحبزادیاں) اور معاون خصوصی راشد نور ہیں' جبکہ مجلس مشاورت میں جناب شوکت صدیقی' محترم ادا جعفری' محترم جمیل الدین عالی' جناب شبنم رومانی اور مسعود احمد برکاتی صاحب شامل ہیں۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ اس مضمون کو کس بناء پر شاملِ اشاعت نہیں کیا گیا۔

(امورِ مملکت خویش خسرواں دانند)

چنانچہ میں نے یہ مناسب سمجھا کہ اس مضمون کو اسی کتاب میں شامل کر لیا جائے تاکہ پڑھنے والے خود اندازہ کریں کہ یہ مضمون ادبی اور تحقیقی لحاظ سے کیا اہمیت رکھتا ہے۔

''آئینہ در آئینہ'' حمایت علی شاعر صاحب کی منظوم خودنوشت سوانح ہے۔ کتاب کا تفصیلی جائزہ لینے سے پہلے ہمارے لئے یہ جاننا بے حد ضروری ہے کہ حمایت صاحب سے قبل اردو ادب اور خصوصاً شعری ادب میں کون کونسی منظوم خودنوشتیں منظرِ عام پر آ چکی ہیں اور ان تمام حقائق کی روشنی میں ''آئینہ در آئینہ'' کا تفصیلی جائزہ لیا جائے۔ مقام کا تعین تو یقیناً آنے والا وقت اور فاضل ناقدین ہی کریں گے۔ یہاں میں سب سے پہلے محترم شفیع عقیل کی اس تحریر کا حوالہ دوں گی جو مذکورہ خودنوشت پر بطور تبصرہ روزنامہ جنگ (۴/اکتوبر ۲۰۰۱ء) میں شائع ہوئی۔ شفیع عقیل صاحب لکھتے ہیں......

''یہ اردو میں پہلی باقاعدہ سوانح حیات ہے۔ باقاعدہ میں نے اس لئے لکھا کہ بعض قدیم شعراء نے اپنی مثنویوں میں اپنی سوانح منظوم کی ہے۔ ۱۹۶۴ء میں ''الزبیر'' بھاولپور میں اردو کے معروف محقق مشفق خواجہ کا ''منظوم آپ بیتیوں'' کے بارے میں ایک مضمون شائع ہوا تھا جس میں واجد علی شاہ اختر کی منظوم خودنوشت ''حزنِ اختر'' کا تذکرہ ہے جو (۱۲۵۰) اشعار پر مشتمل ہے اور

اس میں شاعر نے اپنی اسیری کے حالات نظم کئے ہیں۔ تاہم حمایت علی شاعر کی منظوم خودنوشت کو اس لحاظ سے اولیت حاصل ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی کے حالات وواقعات ابتداء سے اب تک تسلسل کے ساتھ باقاعدہ نظم کئے ہیں اور شاعرانہ مہارت کے ساتھ کئے ہیں۔ شاعر نے نہ صرف اپنے ذاتی حالات بیان کئے ہیں بلکہ ان کی زندگی جن مختلف مراحل سے گزری، جس ماحول سے گزری، انہوں نے اس کی جھلکیاں بھی پیش کی ہیں۔ اس طرح اس میں مختلف ادوار کے ادبی، سماجی اور سیاسی حالات وواقعات کی تصویریں بھی دیکھی جاسکتی ہیں۔''

شفیع عقیل صاحب نے اپنی تحریر میں مشفق خواجہ کے جس مضمون کا ذکر کیا ہے وہ دراصل ''منظوم'' نہیں بلکہ ''مختصر آپ بیتیاں'' کے عنوان کے تحت تحریر کیا گیا ایک تفصیلی مضمون ہے جو صفحہ نمبر ۴۵ تا صفحہ نمبر ۲۸۲ پر محیط ہے اور اس میں (۸۸) اٹھاسی اہلِ قلم کا احوال ان کی خودنوشتوں کے تذکرے کے ساتھ قلم بند کیا گیا ہے۔ اس مضمون میں نثری آپ بیتیوں کے ساتھ کچھ منظوم آپ بیتیوں کا بھی تذکرہ ہے۔ مطالعے کے بعد ایک اور بات بھی واضح ہوتی ہے کہ مذکورہ مضمون میں ''حزنِ اختر'' کا کہیں تذکرہ نہیں ہے بلکہ اس مثنوی کا ذکر عبدالمجید قریشی نے اپنے مضمون بعنوان ''آپ بیتی اردو ادب میں'' (صفحہ نمبر ۲۹ تا صفحہ نمبر ۴۴) صفحہ نمبر ۳۵ پر کیا ہے مگر تفصیل میں وہ بھی نہیں گئے۔

''حزنِ اختر'' واجد علی شاہ اختر شاہ اودھ کے صرف ''زمانہ اسیری'' کو پیش کرتی ہے اس طرح ''حزنِ اختر'' بھی سوانح کی تعریف میں نہیں آتی۔ واضح رہے کہ واجد علی شاہ اختر ۱۸۶۴ء میں بے دخل کئے گئے اور ۱۸۷۶ء میں انتقال کر گئے۔ یوں اس دور کو انیسویں صدی کا آخری دور کہا جاسکتا ہے مشفق خواجہ کے مضمون سے البتہ کچھ اور نام منظوم خودنوشتوں کے حوالے سے سامنے آئے ہیں مثلاً.....

۱۔ محمد علی خان شوق اورنگ آبادی۔ ۱۷۹۹ء (چہار درویش۔ قلمی مخزونہ۔ انجمن ترقی اردو۔ تصنیف ۱۲۱۴ھ منقول ۱۲۱۵ھ)

۲۔ شاہ حسین حقیقت۔ ۱۸۱۰ء (ہشت گلزار۔ صفحہ نمبر ۴۔ مطبوعہ ۱۲۶۷ھ تصنیف ۱۲۲۵ھ)

۳۔ اعزاز الدین نامی مستقیم جنگ ارکاٹی۔ ۱۸۱۷ء (گنج قدرت (محفوظ) مصنفہ ۱۲۳۳ھ مکتوبہ ۱۲۶۶ھ)

۴۔ سائل ارکاٹی۔ ۱۸۳۴ء (مخطوطہ قصہ اگرگل۔ مصنفہ سائل در۔ ۱۲۵۰ھ)

واضح رہے کہ ''حزنِ اختر'' سے بہت پہلے مندرجہ بالا شعراء نے اپنی مثنویوں میں تمہید کے طور پر اپنا مختصر احوال نظم کیا ہے جو ان کی زندگی کے بعض گوشوں پر تھوڑی سی روشنی ڈالتا ہے۔

ان کے علاوہ زندگی کے مخصوص حالات اور واقعات کے حوالے سے کچھ اور بھی تحریریں سامنے آتی ہیں مثلاً.....

۱۔ قول غمی۔ مومن خان مومن کی اس مثنوی کے بارے میں بھی کہا جاتا ہے کہ یہ ان کی ''ذاتی داستانِ عشق'' ہے۔

۲۔ منیر شکوہ آبادی نے بھی ایک دو سفرنامے لکھے ہیں۔

۳۔ مثنوی فریاد داغ۔ جس میں داغ دہلوی نے ''منی بائی حجاب'' سے اپنے عشق کی داستان قلمبند کی ہے۔

یہ تمام آپ بیتیاں ہیں لیکن ان میں بھی جزوی طور پر کچھ حالات قلمبند کئے گئے ہیں لیکن جب ہم بات کرتے ہیں اپنے دور کی تو ہمیں صرف سلیم احمد کی کتاب ''مشرق'' میں آپ بیتی کا کچھ عنصر ملتا ہے۔ سلیم احمد کی یہ کتاب ضخیم ہونے کے باوجود سوانح حیات کی تعریف میں نہیں آتی کیونکہ اس میں مصنف نے اپنے پاکستان آنے کا احوال اور ریڈیو پاکستان کراچی اور فلمی دنیا سے متعلق کچھ احباب کے خاکے قلمبند کئے ہیں۔ اس کے علاوہ کسی بھی تحریر کو ہم آپ بیتی کے خانے میں نہیں رکھ سکتے۔ مثلاً ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنی طویل آزاد نظم ''آدھی صدی کے بعد'' کو بھی منظوم آپ بیتی کا نام دیا ہے۔ اس نظم میں زندگی کے نشیب و فراز کو مختلف علامتوں کے حوالے سے پیش کیا گیا ہے۔ پہاڑ سے پھوٹنے والے جھرنے سے لے کر میدان میں دریا ہو جانے اور سمندر میں ڈوب جانے کی حد تک زندگی کی عکاسی اس انداز سے کی گئی ہے جسے کسی کا بھی ''احوال واقعی'' تو قرار دیا جا سکتا ہے لیکن ڈاکٹر صاحب کی نجی زندگی سے لے کر ان کے عہد کے سماجی اور ادبی زندگی تک کے مختلف واقعات کے حوالے سے رہنما نہیں کہا جا سکتا۔ بہر حال یہ فیصلہ ناقدین ہی کریں گے کہ ایسی نظموں کو سوانح کہا جائے گا یا نہیں.....؟ اس کے علاوہ محترم علی سردار جعفری نے بھی کوشش کی تھی کہ منظوم خودنوشت سوانح تحریر کریں چنانچہ انہوں نے ''نومبر میرا گہوارہ'' کے نام سے اپنے بچپن کے کچھ واقعات شاعرانہ انداز میں آزاد نظم کی صورت میں لکھے ہیں لیکن پھر وہ اسے مکمل نہ کر سکے۔ ''نومبر میرا گہوارہ'' ماہنامہ ''افکار'' کے علی سردار جعفری نمبر میں موجود ہے۔ جن دنوں یعنی اگست 1995ء سے ستمبر 1999ء تک حمایت صاحب کی سوانح ماہنامہ ''افکار'' میں قسط وار شائع ہو رہی تھی ''آسماں محراب'' کے نام سے شمس الرحمٰن فاروقی کا ایک مجموعہ کلام الٰہ آباد سے شائع ہوا تھا۔ اس میں غالباً اسی عنوان سے آزاد نظم کی شکل میں ایک نامکمل نظم موجود ہے جسے انہوں نے بھی سوانح حیات کا نام دیا ہے مگر یہ سوانح بھی علامتی انداز لئے ہوئے ہے۔ جہاں تک میرا محدود علم ہے ان نظموں کے علاوہ دورِ حاضر میں کسی شاعر کی کوئی نظم متذکرہ عنوان سے نہیں ملتی! ربقول شفیع عقیل یا

خود شمس الرحمٰن فاروقی (ان کے ایک خط کی روشنی میں) ''آئینہ در آئینہ'' ہی ایک باضابطہ منظوم سوانح حیات کی تعریف میں آتی ہے۔ چنانچہ اس تمام تمہیدی لیکن بے حد ضروری گفتگو کے بعد میں حمایت صاحب کی منظوم خودنوشت سوانح حیات ''آئینہ در آئینہ'' کی طرف آتی ہوں۔

اس حوالے سے اہم ترین بات یہ ہے کہ حمایت صاحب نے اپنی آپ بیتی مثنوی کے انداز میں نہیں بلکہ ایک پابند نظم کے طور پر تحریر کی ہے جس میں ہر شعر مطلع کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ یہ پوری نظم تقریباً ساڑھے تین ہزار اشعار پر مشتمل ہے اور آخری قسط تحریر کرنے کے بعد ''یار زندہ صحبت باقی'' کہتے ہوئے اس نظم کو ختم کیا گیا ہے..... حمایت صاحب کے اس جملے سے یہ امید بندھتی ہے کہ شاید وہ آئندہ بھی کچھ کہیں لیکن تاریخی حوالے سے یہ ایک زندہ شخصیت کی مکمل آپ بیتی ہے اور آئندہ جو بھی واقعات پیش کئے جائیں گے وہ اس کا ضمنی حصہ ہی محسوس ہوں گے۔

اس طویل خودنوشت میں ندرت کا ایک پہلو یہ ہے کہ حمایت صاحب کی شاعری کے ابتدائی دور سے لے کر اب تک جتنے بھی گوشے سامنے آئے ہیں یعنی ذاتی جذبات واحساسات سے لے کر ملکی اور قومی مسائل تک، جو بھی افکار انہوں نے مختلف نظموں اور غزلوں کی صورت میں لکھے ان کا بھی انتخاب سوانح کے مختلف ادوار میں شامل کرتے گئے اس طرح ان کے شعری ارتقاء کا ایک گراف بھی سامنے آجاتا ہے۔ دوسرے ہر دور کی وہ سچائیاں، جو اس دور کے اہلِ قلم کی توجہ کا مرکز رہیں اور معرضِ تحریر میں آتی گئیں، وہ بھی محفوظ ہوگئیں۔ مصنف نے اس نظم کا آغاز اپنے آبائی وطن اورنگ آباد کے تاریخی پس منظر سے کیا ہے اور اپنے اجداد سے لے کر اپنے والد اور والدہ مرحومہ کے حوالے سے جو بھی سنی ہوئی باتیں تھیں، انہیں اپنی یادداشت میں محفوظ رکھا اور انہیں افسانوی انداز اور شاعرانہ پیرائے میں اپنی سوانح حیات میں منتقل کردیا۔ حمایت صاحب کی والدہ کا انتقال اس وقت ہوا جب وہ صرف تین برس کے تھے اس لئے وہ اس حقیقت کو صرف افسانوی انداز میں ہی بیان کرسکتے تھے اور جو کچھ اس عمر کے بچے کے ذہن میں شعوری اور لاشعوری طور پر محفوظ رہ سکتا تھا اسے بڑے قرینے سے انہوں نے نظم کردیا ہے۔ البتہ ان واقعات کا ذکر زیادہ تفصیل سے کیا ہے جو شعوری طور پر ان کی یادداشت کا حصہ ہیں.....

نثر میں جو سوانحات ہمارے مطالعے میں آتی ہیں اس میں تو ہر واقعہ کا ذکر تفصیلاً ہوتا ہے۔ لیکن نظم میں چونکہ اختصار مقصود ہوتا ہے اس لئے شاعر صرف ان واقعات کا ذکر کرتا ہے جو بہت ہی اہم ہوتے ہیں۔ حمایت صاحب نے بھی اپنی عمر کی ابتدائی منزلوں سے یہ سفر شروع کیا اور موجودہ دور تک آتے آتے وہ جن راستوں سے گزرے، جن مسائل سے نبرد آزما رہے، جن خوشیوں اور غموں سے دوچار ہوئے۔ ان سب کا شاعرانہ انداز میں ذکر کرتے ہوئے بیشتر تاریخی حوالے بھی دیئے

ہیں۔ اکثر شخصیات اور ان تمام دوستوں کے نام بھی بتائے ہیں جو ان کی زندگی پر اثر انداز ہوتے رہے یا ان کی ذہنی و شخصی تعمیر میں ممد و معاون ثابت ہوئے۔ انہوں نے اپنے افکار کا تجزیہ کرتے ہوئے مختلف ادوار کا جائزہ بھی لیا ہے اور ایسے حوالے بھی دیئے جس سے ان کی صداقت کا یقین ہو جاتا ہے۔ اکثر واقعات کے تاریخی حوالے یعنی سن اور مقامات بھی ان کی سوانح میں نظر آتے ہیں۔ بالخصوص پاکستان میں انہوں نے جیسی بھی زندگی گزاری اور جن حالات کا سامنا کیا ہے اس کا ہمیں تاریخ وار علم ہوتا ہے اور ہمارے ملک میں سماجی، سیاسی اور معاشی طور پر جو بھی مدارج آئے ہیں اور ترقی و تنزل کے جتنے بھی پہلو نمایاں ہوئے وہ سب اس سوانح حیات میں موجود ہیں۔

عموماً ہوتا یہ ہے کہ اپنی آپ بیتی لکھنے والا بعض صداقتیں بیان کرنے سے بہ وجوہ گریز کرتا ہے۔ ممکن ہے حمایت صاحب نے بھی دور اندیشی کی بناء پر یا کسی کی دل شکنی کے خیال سے یا پھر اپنی ''فطری احتیاط پسندی'' کے نتیجے میں بعض واقعات سے گریز کیا ہے (یہ میرا خیال ہے) ''لیکن خودنوشت کے بعض حصے ان کی زندگی کے کمزور لمحات کے بھی گواہ ہیں۔'' شاعر کے ساتھ سب سے بڑا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے کلام کے بین السطور میں بھی سچائیاں لکھ جاتا ہے اور چونکہ شاعری میں اشاروں اور کنایوں میں حقیقت بیان کی جاتی ہے اس۔ لئے بعض اوقات بے خطر ہو کر شاعر وہ بھی لکھ جاتا ہے جو شاید نثر میں نہ لکھا جا سکے اور ایسی چیزیں اکثر شعراء کے کلام میں شہ پاروں کے طور پر موجود ہوتی ہیں کیونکہ وہ ان لمحوں کی سچی ترجمان ہوتی ہیں۔ حمایت صاحب کے کلام میں بھی ایسی نظمیں اور غزلیں میری نگاہ سے گزری ہیں جو ان مخصوص لمحوں کی گواہی دے سکیں۔ سو وہ نظمیں ''ایک عہد کا سچ'' بن کر ہمیں بہت سی حقیقتوں سے آشنا کراتی ہیں۔ ایسی نظموں میں ''جذباتی نظمیں'' ''سیاسی نظمیں'' اور بعض معاشرتی موضوعات پر لکھی گئی نظمیں شامل ہیں۔ اس سوانح حیات کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ حمایت صاحب نے وہ مسرتیں یا وہ کیفیات جو زندگی میں انہیں پہلی بار عطا ہوئیں انہیں بھی بڑے قرینے سے لکھ دیا ہے۔ وہ موضوعات خواہ محبت کے جذبے سے تعلق رکھتے ہوں یا وہ کسی بڑی خوشی کے حصول سے متعلق ہوں۔ انہوں نے تمام تر نازک محسوسات و جذبات کی عکاسی بڑے خوبصورت انداز سے اس سوانح میں کی ہے۔

حمایت صاحب کی زندگی بڑے نشیب و فراز سے گزری ہے۔ وہ حقیقتاً سیلف میڈ انسان اور سیلف میڈ شاعر ہیں۔ بیشتر تارکینِ وطن کی طرح انہوں نے یہاں کسی کلیم کی معرفت حکومت پاکستان سے کچھ حاصل نہیں کیا۔ صرف اس لئے کہ اگر وہ یہاں کچھ حاصل کر لیتے تو اس کا اثر ہندوستان میں موجود ان کی دوسری والدہ اور بہن بھائیوں پر پڑتا اور یہ حمایت صاحب کو کسی طور منظور نہ تھا۔ انہوں نے اپنی زندگی کی ابتداء اپنے پیروں سے چل کر کی۔ یہ سوانح ان کی

طرف بھی اشارہ کرتی ہے کہ انہوں اپنی زندگی بنانے میں کسی کا سہارا نہیں لیا۔

حمایت صاحب نے ۱۹۵۱ء میں پاکستان ہجرت کی تھی جب وہ صرف میٹرک پاس تھے۔ لیکن عملی زندگی کا آغاز وہیں ہو چکا تھا۔ ۱۴ فروری ۱۹۴۹ء کو وہ محترمہ معراج نسیم سے شادی کر چکے تھے (اس حساب سے آج ان کی شادی کو 53 سال دو دن ہو چکے ہیں) جب وہ پاکستان آئے تو صاحب اولاد تھے۔ اب یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ ان ذمہ داریوں کے ساتھ زندگی کو سنوارنا' خود کو اعلیٰ تعلیم یافتہ بنانا اور اپنے آٹھ (ماشاءاللہ) بچوں کو بھی اعلیٰ تعلیم سے نواز کر تمام مسائل سے سبکدوش ہو جانے تک حمایت صاحب نے کس قدر محنت کی ہوگی۔ جو لوگ حمایت صاحب کو جانتے ہیں وہ گواہی دیں گے کہ یہ سوانح حمایت صاحب کی زندگی کے ان تمام پہلوؤں کی آئینہ دار ہے۔

حمایت صاحب نے ریڈیو' فلم' ٹیلیویژن' صحافت اور تدریس ہر شعبے میں کام کیا ہے۔ وہ مشکل سے مشکل مراحل سے بھی گزرے۔ ان کے ہم عصروں میں اکثر ان کی راہ میں رکاوٹیں بھی کھڑی کرتے رہے اور جیسا کہ ہمارے معاشرے کا انداز ہے کہ لوگ خواہ مخواہ ایک دوسرے سے حسد کرنے لگتے ہیں۔ حمایت صاحب کو ایسے دوست نما دشمنوں سے بھی نمٹنا پڑا۔ اس کتاب میں ایسے تمام واقعات کا جزوی طور پر حوالہ ملتا ہے اور ان کی اس دور کی کہی ہوئی غزلیں اور نظمیں بھی ان کے مخصوص احساسات و جذبات کا آئینہ دکھاتی ہیں' لیکن مجموعی طور پر نہ صرف میں بلکہ حمایت صاحب کے تمام جاننے والے اس بات کی گواہی دیں گے کہ وہ ایک کامیاب انسان ہیں۔ انہوں نے بڑی پامردی سے ہر مشکل کا مقابلہ کیا اور سرخرو ہوئے۔ حمایت صاحب نے جو چوکھی لڑائی لڑی ہے اس کی گواہ ان کی یہی کتاب ہے۔

حمایت علی شاعر نے اپنا اور اپنے ہم عصروں کا احوال نظم کرتے ہوئے اپنے عہد کے قومی اور ملکی وسائل کا بھی تجزیہ کیا ہے۔ بالخصوص ایسے مسائل جو سیاسی' مذہبی اور لسانی موضوعات سے متعلق تھے۔ ان کی سوچ ہر مسئلے میں آزادانہ اور غیر متعصبانہ رہی ہے۔ ون یونٹ کے قیام نے قومی سطح پر جو الجھنیں پیدا کیں اور لسانی مسائل نے باہم جو فاصلے پیدا کر دیئے تھے وہ سب حمایت صاحب کی فکر کا موضوع بنے۔ یہی سبب ہے کہ مسائل کے تجزیئے میں کچھ لوگوں نے حمایت صاحب کو غلط بھی سمجھا اور وہ حقائق کی تہہ تک پہنچے بغیر ان کی مخالفت پر آمادہ ہو گئے۔

مشرقی پاکستان کے بنگلہ دیش ہو جانے کے محرکات بھی ایک خاص نقطہ نگاہ کے حضرات کا موضوع فکر بنے اور پورا ایک سال مراسلہ بازی اور کالم نگاری کی نذر ہو گیا۔ حمایت صاحب نے بنگالی مسلمانوں کے حق تلفیوں اور وہاں آباد غیر بنگالیوں کی روش کا صداقت کی بنیاد پر جائزہ لیا تھا بو ایک خاص حلقہ پر گراں گزرا اور وہ مجموعی طور پر حمایت صاحب پر برس پڑے۔ طنزیہ اشعار ہی

اشعار پر اپنی آپ بیتی کو ختم کیا ہے اس میں ایک شعر یہ بھی ہے۔

بس ایک کام کیا میں نے زندگی بھر میں
تمام بچے ہیں تعلیم یافتہ گھر میں

اس شعر سے ان کی شخصیت کے جس پہلو پر روشنی پڑتی ہے یہ کتاب ''آئینہ در آئینہ'' اس کا عکس دکھائی دیتی ہے۔ اپنی نوعیت کے اعتبار سے منفرد اس شاندار تخلیق پر بلاشبہ حمایت صاحب نہ صرف مبارکباد کے مستحق ٹھہرتے ہیں بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ ہمیں ان کا ممنون بھی ہونا چاہیے۔

16 فروری 2002ء کو آرٹس کونسل (کراچی) کے زیر اہتمام ''آئینہ در آئینہ'' کی تقریب رونمائی کے اجلاس میں پڑھا گیا۔ (مرتب)

اردو شاعری میں پہلا تجربہ

(ساڑھے تین ہزار پابند اشعار پر مشتمل)

حمایت علی شاعر کی منظوم سوانح حیات

آئینہ در آئینہ

(دوسرا ایڈیشن)

آپ بیتی ہے!

دنیائے ادب

624۔ریگل ٹریڈ اسکوائر' ریگل چوک' صدر کراچی

آئینہ در آئینہ

(امریکہ اور کینیڈا میں)

حمایت علی شاعر کی منظوم خودنوشت سوانح حیات ''آئینہ در آئینہ'' جو تقریباً ساڑھے تین ہزار اشعار پر مشتمل ہے امریکہ اور کینیڈا کے ادب دوستوں میں ابھی بڑے ذوق وشوق کے ساتھ پڑھی جا رہی ہے۔ اب تک اس کتاب کی تین سو سے زیادہ جلدیں یہاں فروخت کی جا چکی ہیں۔ پچھلے سال جب یہاں..... واشنگٹن، ہیوسٹن، ڈیٹرائٹ اور ٹورنٹو میں حمایت علی شاعر کے یادگار تاریخی جشن منائے گئے تو ان محفلوں میں بھی ان سے اس نظم کے بیشتر اشعار سنے گئے۔ ''آئینہ در آئینہ'' کی ہمہ گیر مقبولیت کے پیش نظر انگریزی کے استاد اور مشہور شاعر و ادیب جناب جاوید زیدی نے اس کتاب کا انگریزی میں ترجمہ بھی کرنا شروع کر دیا۔

جاوید زیدی نے پچھلے سال ہیوسٹن (امریکہ) میں اپنے چند دوستوں کے تعاون سے ہیوسٹن (امریکہ) میں ایک ''ٹرانسلیشن بنک'' قائم کیا جس کا افتتاح 13 اگست 2001ء کو حمایت علی شاعر کے ہاتھوں عمل میں آیا تھا۔ اس ادارہ کے زیر اہتمام اردو کتابوں کے (رومن رسم الخط کے ساتھ) انگریزی تراجم بھی شائع کئے جا رہے ہیں۔ اس سلسلے کی پہلی کتاب عدیل زیدی کا مجموعۂ کلام ''چلتے چلتے'' کے نام سے شائع کیا گیا۔ دوسری کتاب ''آئینہ در آئینہ'' کا انگریزی ترجمہ Mirror By Mirror کے نام سے جاوید زیدی کر رہے ہیں جس کے کچھ حصے مقامی اخبارات میں شائع ہو چکے ہیں۔

''آئینہ در آئینہ'' کا ایک ایڈیشن اردو، ہندی اور رومن رسم الخط میں ''المصنفین'' کے زیر اہتمام ہندوستان سے بھی شائع ہونیوالا ہے۔ یہ کتابیں انشاء اللہ جلد ہی پاکستان سے بھی شائع ہو جائیں گی

4۔ رائٹرز گلڈ آدم جی ادبی ایوارڈ (مجموعہ کلام) ''مٹی کا قرض''۔1974ء

5۔ عثمانیہ گولڈ میڈل (بہادر یار جنگ کلب)۔1987ء

6۔ نقوش ایوارڈ (لاہور) 1987ء

7۔ نگار ایوارڈ (''عقیدت کا سفر'' ٹی وی سیریل) 1988ء

8۔ مخدوم محی الدین عالمی اردو ایوارڈ (عالمی اردو کانفرنس۔ دہلی)۔1989ء

9۔ علامہ اقبال ایوارڈ (مجموعہ کلام) ''ہارون کی آواز''۔1985ء

(پانچ برس کے ایوارڈز کا مجموعی اعلان 1991ء میں کیا گیا اور صدر پاکستان، سردار فاروق احمد خان لغاری نے اکادمی ادبیات کے زیر اہتمام اہل قلم کانفرنس 1993ء میں متعلقہ حضرات کو ایوارڈ عنایت کیے)

10۔ ساہتیہ اکیڈیمی ایوارڈ (لکھنو) ''خدمات کا اعتراف''۔1991ء

11۔ ایوارڈ برائے اعلیٰ کارکردگی (ریڈیو پاکستان)۔1993ء

12۔ موجد ''ثلاثی'' ایوارڈ (انجمن طلباء قدیم جامعہ عثمانیہ) شکاگو۔1993ء

13۔ وثیقہ اعتراف (ہمدرد فاؤنڈیشن)۔1994ء

14۔ لائف لانگ لٹریری اچیومنٹ ایوارڈ (ایسٹرن آرٹ فورم) نیوجرسی۔1994ء

Life Long Literary Acheivement Award By MAYAR Peter Canto. New Jersey (USA) From "Eastern Art Forum"

15۔ امریکہ کی اعزازی شہریت (ادبی خدمات کے اعتراف میں)۔1995ء

Honorary Citizenship of Boling Brook By MAYAR Roger.c. Clear. Chicago (USA)

16۔ بہترین ڈرامہ نگار ''شکست کی آواز'' (منظوم یک کرداری تمثیل۔ چھ سو مصرعے) ریڈیو پاکستان کراچی۔1999ء

17۔ ٹاپ ٹین ایوارڈ

Top Ten Award Orient International Hyderabad (Broadcaster, Poet, Author, Filmmaker and Director)-1999

18۔ ''نشانِ اردو'' (اردو سوسائٹی۔ آسٹریلیا)۔2000ء

19۔ نیاز فتح پوری ایوارڈ (حلقہ نیاز و نگار پاکستان)۔2000ء

20-نشان فضیلت(سادات امروہہ)-2000ء
21-نشان اعزاز(انجمن طلباء قدیم جامعہ عثمانیہ)پاکستان-2001ء
22-لائف اچیومنٹس ایوارڈ(ادبی مرکز-واشنگٹن)
بدست ڈاکٹر ملیحہ لودھی، سفیر پاکستان برائے امریکہ-2001ء

23- ○-Award Of Rcecognition
From Young Tarng Radio-Huston-2001

24- ○-Award Of Rcecognition
From Govt. Of Ontario, Canada-2001
By Mr. Frank klees & Mr. Jim Karygiannies, MPP

25-صدارتی ایوارڈ برائے حسن کارکردگی
○-Pride Of Performance
(اس ایوارڈ کا اعلان 14 اگست 2001ء کو ہوا اور 23 مارچ 2002ء کو صدر پاکستان جناب پرویز مشرف نے ایوان صدر اسلام آباد میں عنایت کیا)

تدریس

1- سچل سرمست کالج (حیدر آباد سندھ)1963ء
2-سندھ یونیورسٹی اکتوبر 1977ء تا جولائی 1986ء
3-بیجنگ یونیورسٹی(عوامی جمہوریہ چین)
(مرکزی وزارت تعلیم پاکستان کی طرف سے تقرر مگر طبیعت کی ناسازی کے سبب معذرت)

صحافت

روزنامہ جناح، منزل اور ہمدرد
حیدر آباد دکن-1948ء تا 1950ء

ادارت

سازِ نو (حیدر آباد دکن)1949ء
شعور(حیدر آباد سندھ)1949ء
صریر خامہ (سندھ یونیورسٹی) اقبال نمبر 1977ء-نعت نمبر 1978ء

ثقافت

"ارژنگ" کے زیر اہتمام

1- بنگال سے کوریا تک

نظم (سندھ یونیورسٹی کے اسٹیج پر ٹیبلو میں پیش کی گئی) 1959ء

2- اندھیرے اجالے (ڈرامہ)

حیدر آباد سندھ میں اسٹیج کیا گیا۔ 1959ء

ریڈیو

1- دکن ریڈیو اور آل انڈیا ریڈیو۔ حیدر آباد

اسٹاف آرٹسٹ 1947ء تا 1950ء

2- ریڈیو پاکستان

کراچی، حیدر آباد (سندھ) اسٹاف آرٹسٹ - 1951ء تا 1962ء

(ریڈیو پاکستان سے ادبی پروگرام اب بھی پیش کرتے رہتے ہیں)

ٹیلی ویژن

پاکستان ٹیلی ویژن، لاہور - کراچی - اسلام آباد اسٹوڈیوز سے بالترتیب مختلف ادبی اور تحقیقی پروگرام پیش کیے

1- غزل اس نے چھیڑی (اردو غزل کے سات سو سال) 1974ء

2- کسوٹی (ذہنی آزمائش کا پروگرام) 1977ء

3- خوشبو کا سفر (علاقائی زبانوں کے شعراء کا اردو کلام - پانچ سو سال) 1988ء

4- عقیدت کا سفر (اردو نعتیہ شاعری کے سات سے سال) 1988ء

5- لب آزاد (احتجاجی شاعری کے چالیس سال) 1989ء

6- عقیدت کا سفر (پاکستان میں نعتیہ شاعری) 1995ء

7- محبتوں کے سفیر (سندھی شعراء کا اردو کلام - 500 سال) 1969ء

8- نشید آزادی (تحریک آزادی میں اردو شاعری کا حصہ 1857ء تا 1947ء

(مختلف سلسلہ وار پروگرام اب بھی پیش کرتے ہیں)

فلم

فلموں کے نغمات، مکالمے اور منظر نامے (1961ء تا 1976ء)

1- بحیثیت نغمہ نگار پہلی فلم "آنچل" (1962ء)

2- بحیثیت نغمہ نگار و مکالمہ نگار پہلی فلم "تصویر" (1965ء)

3- بحیثیت فلم ساز و نغمہ نگار پہلی فلم "لوری" (1966ء)

4- بحیثیت فلم ساز و ہدایت کار و نغمہ نگار پہلی فلم "گڑیا" (1976ء)

اعترافات

1-حمایت علی شاعر نمبر
(مطبوعہ 2/جون 1985ء، روزنامہ اورنگ آباد ٹائمز، مہاراشٹر)
2-گوشہ حمایت علی شاعر
(مطبوعہ 10/اگست 1987ء، روزنامہ کلیم سکھر)
3-گوشہ حمایت علی شاعر
(مطبوعہ جولائی 1995ء، ماہنامہ طلوع افکار کراچی)
4-گوشہ حمایت علی شاعر
(مطبوعہ اکتوبر تا دسمبر 1995ء، سہ ماہی مجلّہ عثمانیہ کراچی)
5-حمایت علی شاعر نمبر (سوا چھ سو صفحات پر مشتمل)
(مطبوعہ 14/جولائی 1996ء، مجلّہ "شخصیت" کراچی
The Scholar Poet-6
حمایت علی شاعر۔ فن اور شخصیت (انگریزی مضامین پر مشتمل)
مرتب : پروفیسر عبدالقوی ضیاء۔ کینیڈا
مضامین نگار :
(پروفیسر عبدالقوی ضیاء۔ یونس احمر۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی۔ خوشونت سنگھ۔ پرکاش چندر۔ پروفیسر نظیر صدیقی۔ پروفیسر اظہر قادری۔ آفتاب احمد خاں۔ پروفیسر نسیم نیشو فوز۔ حمیرا اشتیاق۔ سکندر سرور۔ نسیم سیماب۔ سید رضوان اللہ۔ آصف نورانی۔ بلدیو مرزا اور انور نسیم وغیرہ)

مقالات

1-مقالہ برائے ایم۔اے اردو ادب
موضوع :
حمایت علی شاعر۔ فن اور شخصیت
مقالہ نگار : رشید احمد رشید۔ سندھ یونیورسٹی

2-مقالہ برائے ایم۔اے اردو۔ کراچی یونیورسٹی

3-مقالہ برائے پی ایچ ڈی۔ کراچی یونیورسٹی
موضوع :
حمایت علی شاعر کی ادبی خدمات کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ

مقالہ نگار : محترمہ رعنا اقبال، ایم اے اردو ادب - ایم اے بین الاقوامی تعلقات - ایم اے ابلاغ عامہ - کراچی یونیورسٹی
(لیکچرار - شعبہ ابلاغ عامہ، وفاقی گورنمنٹ اردو کالج - کراچی)

اختلافات

1- احوال واقعی
(حیدر آباد سندھ میں ادبی سیاست) 1994ء
مرتب: مرزا سلیم بیگ
اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو - سندھ یونیورسٹی - جام شورو

2- چراغ بکف
(کراچی میں ادبی سیاست) ایک دستاویز

3- بارش سنگ سے بارش گل تک
آئینہ در آئینہ کے بارے میں متنازعہ تحریریں واہل نظر کے تاثرات
مرتب : محترمہ رعنا اقبال
لیکچرار شعبہ ابلاغ عامہ، وفاقی گورنمنٹ اردو کالج کراچی

مطبوعہ کتب

1- شعری مجموعے (پہلا ایڈیشن)

i- آگ میں پھول (نظمیں، غزلیں، رباعیات) 1956ء
2- مٹی کا قرض (ثلاثیاں، نظمیں، غزلیں) 1974ء
3- تشنگی کا سفر (طویل افسانوی و تمثیلی نظمیں) 1981ء
4- ہارون کی آواز (نظمیں اور غزلیں) 1985ء
5- حرف حرف روشنی (منتخب کلام) 1986ء
6- عقیدت کا سفر
(تالیف و تحقیق - نعتیہ شاعری کے سات سو سال - حصہ اول) 1999ء
7- آئینہ در آئینہ
(منظوم خود نوشت سوانح حیات - اردو شاعری میں پہلا تجربہ) 2001ء
(ان میں بیشتر کتابوں کے ہندوستانی ایڈیشن بھی شائع ہو چکے ہیں)

نثری مجموعے (پہلا ایڈیشن)

1- شیخ ایاز (جدید سندھی ادب کا عہد آفریں شاعر) 1978ء

2- شخص و عکس (تنقیدی مقالات و مباحث) 1984ء
3- کھلتے کنول سے لوگ (دکن کے اہل قلم) 2000ء

تراجم

بنگال سے کوریا تک (1952-1953ء)
(عالمی امن کے موضوع پر لکھی ہوئی طویل افسانوی نظم کے مختلف لسانی روپ)

1-Flower in Flames (انگریزی)
مترجم- پروفیسر راجندر سنگھ ورما (پنجاب یونیورسٹی، پٹیالہ، انڈیا)
2-Flute and Bugle (انگریزی)
مترجم- پرکاش چندر- ایڈیٹر "ٹائمز آف انڈیا" (لکھنؤ)
3- گل باہ مہ (سندھی)
مترجم- ایم ای عالمانی (حیدر آباد سندھ)
4- بنگال سے کوریا تک (ہندی)
پروفیسر جی این نداف، ابوالکلام آزاد کالج (اورنگ آباد، مہاراشٹر)
5-(تلگو) ڈاکٹر وسرتی (حیدر آباد دکن، آندھرا پردیش)

تراجم

حرف حرف روشنی (منتخب کلام)
1-Every Word Aglow (انگریزی)
مترجم- پروفیسر راجندر سنگھ ورما
2- شبد شبد پرکاش (ہندی)
مترجم- قاضی رئیس (اورنگ آباد، مہاراشٹر)
3- حرف حرف روشنی (ہندی)
مترجم- بھگ تل (مہاراشٹر)

حمایت علی شاعر

جاء ڈرامہ

سندھی تراجم
1- مفاصلہ (فاصلے) رشید احمد لاشاری
2- دشمن آساں پنچو (دشمن آساں اپنا) ایم بی انصاری
3- واچو ڑو (بگولا) ممتاز مرزا
4- برزخ (برزخ) محمد اسحاق پیر سرہندی

غیر مطبوعہ کتب

1- ثلاثی (تین مصرعوں کی وحدت) ایک نئی صنف سخن
2- چاند کی دھوپ (تازہ کلام)
3- اپنے پرچم تلے (قومی نغمے اور غنائیے)
4- سرگم (گیت اور نغمے)
5- کہی ان کہی (رومانی شاعری کا انتخاب)
6- زاویے (ریڈیائی ڈرامے) منظوم و منثور
7- اندھیرے اجالے (اسٹیج ڈرامہ)
8- مہران موج (سندھ کی لوک کہانیوں کی ڈرامائی تشکیل)
9- عقیدت کا سفر پاکستان میں نعتیہ شاعری - جلد دوم (ٹی وی سیریل)
10- خوشبو کا سفر
علاقائی زبانوں کے شعراء کا اردو کلام - پانچ سو سال (ٹی وی سیریل)
11- لب آزاد
پاکستان میں احتجاجی شاعری کے پچاس سال (ٹی وی سیریل)
12- نشید آزادی
(تحریک آزادی میں اردو شاعری کا حصہ - 1857ء تا 1947ء)
13- محبتوں کے سفیر
(سندھ میں اردو شاعری کے پانچ سو سال - 1999ء)
14- کچھ پیش رو - کچھ ہم سفر (تنقیدی مقالات)
15- نئی پود (نئی نسل کے اہل قلم)
16- مسائل و مباحث (مضامین اور خطوط)
17- نقطہ نظر (تحقیقی اور تجزیاتی مضامین)
18- چنگاریاں (اردو شاعرات کا مطالعہ)
19- مجھے یاد ہے وہ ذرا ذرا (یاداشتیں - ریڈیو سیریل)
20- گردش (سفرنامہ)

سیاحت

امریکہ، کینیڈا، برطانیہ، ناروے، سویڈن، جنوبی افریقہ، کینیا، بوٹسوانا، موریشس، چین، سعودی عرب، کویت، مسقط، قطر، بحرین، عرب امارات، ہندوستان، بنگلہ دیش اور آسٹریلیا

Prof. Sehar Ansari said "Aiana dar aaina" was first complete versified autobiography ub Urdu. He had very ably described his childhood years, the formative period of his life and the conflict of thoughts his mind in young age was engaged with, Dr. Peerzada Qasim paid generous complements to his senior poei describing him as 'a pathfinder' and his book a very important document of the time. He recalled Shair,s long poem Bengal Say Korea Tak written on the need of universal peace, and may other verses and admired him as a very genuine and truthful person and poet.

Other speakers included N.D.Khan, a known political leader, who had great admiration for Shair, and he said a poet's autobiography was invaribaly the biography of his age because poets represented their people.

S.H..Hashmi, Vice President of Arts Council, and Saifur Rahman Grami praised Shair, and the later expressed his gratitude on being the host on such an auspicious occasion.

Jazib Qureshi read out a paper on "Aaina dar aaina" and analyzed critically its qualities pointing out the lined where he differed. His some biographical accounts of Shair,s life. Earlier. an article of similar nature was read out by Raana Iqbal which covered most parts of Shair,s life and work.

The last to speak Shair himself, paying thanks to the guests. He recited a few verses on persistent request from the audience. Elderly poet Raghib Moradabadi recited verses written for the occasion, congratulations Shair for his valuable contribution to literature.

The ceremony, which lasted till late in evening, was well attended.

(Daily "DAWN" Karachi, feb.18. 2002)

Versified autobiography

HASAN ABIDI

Aaina dar aaina the versified autobiography of noted poet Himayat Ali Shair, was launched on saturday at Pakistan Arts Council.

Dr.Farman Fatehpuri who presided over the proceedings, said, Shair,s long verse was a historical narrative and also a biography of his contemporary writers. In that way Shair is a great poet, and his poetry real, genuine and truthful. He introduced ' Salasi' the shortest form of poetry and composed long poems as well which proved the dexterity of his innovative mind, Dr. Farman said, adding that this verse, Harf Harf Roshni, was not only addressed to his children but to the entire new generation.

There was a long line of prominent writers who has come to evaluate Shair,s verse and pay their complements to a noted contemporary poets, also a writer who has contributed to culture and art in different ways. A broadcaster, a researcher, a teacher, a film maker, a compere at the television and a poet much sought after in mushairas in and outside the country, Shair was acknowledged by everyone as a' representative of our time.'

Dr. Muhammad Ali Siddiqui said , Aina .... Was first if its kind written at a time when cultural values were deistintegrating. Shair had given a graphic and a very fascinating account of Aurangabad before the fall of Hyderabad Deccan and narrated the early years of Pakistan, when a hunt for easy wealth was rampant. Being a progressive poet, Shair had made his experiences of life as our own, Siddiqui said.

Like many of his contemporaries, Himayat migrated to Pakistan and was soon disillusioned by the turn of events. But his faith in the ultimate triumph of mankind and the success of the struggling forces of justice and freedom remained a constant factor in his literary life.

During his professional assignments in Jamshoro University of Hyderabad, he came in contact with the leading poet of Sindh, Sheikh Ayaz. Ayaz and other Sindhi writers and poets influenced his thinking and reinforced his faith in humanity.

It was quite appropriate for him to decide to write his biography. But here again he did not lose his ingenity. The biography was written in verse and was published in the prestigious monthly jounal, Afkar, from August 1995 to September 1999. And now the biography has appeared in book form titled Aiana dar aaina.

It is an account of a period when society was being restructured and two new independent countries were in the process of being formed. As a keen observer, he intently watched the development but refused to give up his faith in mankind.

Aaina dar aaina not only reflects the thoughts of the poet. It also mirrors the currents and cross-currents of history in its formative period. The poet remembers with affection hid friends whom he left behind in Deccan.

Himayat Ali Shair is a versatile poet. With a rich background of the classics, he has successfully experimented various other forms and genres of poetry. The book represents his grasp of the art of communication.

The readers would, however wish him to write in prose a comprehensive history of the lost days. That is the only appropriate format available to a biographer. Writing history in verse can be an exciting exercise, but it cannot convey facts comprehensively. Poetry has its own limitations. This was realized about a hundred years ago by Ghalib who wrote letters to his friends when he had

Contiuedonpage171

Versifying One's Life

Akhtar Payami

It was a strange phenomen on that the princely state of Hyderabad, Deccan, produced a number of progressive writers and poets who emerged from the conventional and obsolete traditions of an inward-looking society. They bravely fought against conservatism and primitive values. If there was the eccentric Qasim Rizvi who was fond of day-dreaming and building castles in the air and whose charismatic appeal attracted a large number of young people to his movement, there were also many ardent fighters for freedom like Makhdoom Mohiuddin, Muslim Ziaee, Sulaiman Ureb, Qamar Saheri and others. Himayat Ali Shair was one of them. Fortunately for Deccan, Qasim Rizvi lost Battle.

Himayat Ali Shair has lived a full and eventful life. From his childhood in Aurangabad which was his birthplace, he nursed an irrepssible desire to change the pattern of society. Moving from one place to another, he carried with him an idealism that was the hallmark of his generation. Never succumbing to pressures, he acted as a determined man to carve his own path. From an early age, he made his mark in the literary field. His poems and prose pieces were published in many reputed journals of the subcontinent.

Two major factors might have influenced his life to a great extent. He came from a deeply religious background. And he was the son of a police officer. But these two overriding factors could not deter him from pursuing his rebellious mission. In character, there is one trace of rigidity that orthodoxy generally breeds. And he has to inherited any orthodoxy manners from his father. But his verses could not conceal his bitternes that originated from his personal relation with the distant members of his family.

the ruler alike. In short we participate in the epic journey of Himayat Ali Shair from his childhood days to what he is today.

The autobiography is the product of Himayat Ali Shair's whole career, and is especially interesting as and evidence of his ideas on life and literature of those times. Without question, it is one of the most sonorous, at times, robust and delicate works in verse form; and in doing so, he has challenged and reshaped literature, as this is the first autobiography of its kind in Urdu.

Last but not the least, the material of his life, death and mortality aside, his passionate friendships, his unorthodox marriage, his love for his children, his role as a man of letters, is placed within the context of art, he has shown outstanding insight and sense of richness and vitality.

Contiued from page 169

something substantial to say. Poetry is essentially an expression of emotions. This medium should not be abused. Small wonder Aaina dar aaina becomes prosaic at places. Himyat should know that he is not a mechanical versifier but a genuine poet.

(Daily "DAWN" Karachi, March 17.2002)

"تطہیر" کے بعد

اردو کے بزرگ محترم اور مستند شاعر

حضرت اطہر ضیائی

کا دوسرا مجموعہ کلام

ترجیم

(زیرِ طبع)

ندا پبلیکیشنز

MIRROR IN MIRROR
AN OVERVIEW

Ikram Berlvi.
(TORANTO – CANADA)

Himayat Ali Shair needs no introduction. He is a poet of repute, a Radio and T.V. programmer, a film Director and producer, an Educator and incorrigible Journalist. He has authored, as many as, nine books: Six in poetry and three in prose besides a number of translations of regional languages of Pakistan. Now he has come out with a monumental work of art – his autobiography in verse. The vigor, the frankness and the range of the autobiography, "Mirror in Mirror" make it unrivalled in Urdu Literature.

In this autobiography, Himayat Ail Shair began unfolding his life and lineage when he was only a young boy of ten. His intention, probably, was to let the world know what manner of man and mental of artist he is. In turns brutal and tender, irreverent and fervently devout, self-pitying and defiant Himayat Ali Shair does indeed shown, almost, every facet of his life and image. Besides, revealing his own flamboyant character and attributes Himayat Ali Shair shows us the age in which he lived so well and moved ahead. He has very tautly described the social ills, the political guiles and horrifying intrigues of the courts and taverns and the streets of aurangabad and also the great cities of India and Pakistan before and after the great divide.

To illustrate all this, he has vividly portrayed the humor and rivalries, the passions and the tragedies of his times. While reading this autobiography, we see great and small people move over and over hear their grumbling and squabbles, and watch beside the throne of the Nawabs and

حمایت علی شاعر کی مطبوعہ و غیر مطبوعہ کتب

شعری مجموعے

1- آگ میں پھول (نظمیں، غزلیں، رباعیات) 1956ء
2- مٹی کا قرض (ملایاں، نظمیں، غزلیں) 1974ء
3- تشنگی کا سفر (طویل افسانوی تمثیلی نظمیں) 1981ء
4- ہارون کی آواز (نظمیں اور غزلیں) 1985ء
5- حرف حرف روشنی (منتخب کلام) 1986ء
6- آئینہ در آئینہ (منظوم خودنوشت سوانح حیات)

نثری مجموعے

1- شیخ ایاز (جدید سندھی ادب کا عہد آفریں شاعر) 1978ء
2- فحص و نکس (تنقیدی مقالات و مباحث) 1984ء
3- کھلتے کنول سے لوگ (دکن کے اہل قلم) 2000ء

مرتب مجموعے

1- دودِ چراغِ محفل (شعری انتخاب) 1959ء
2- عقیدت کا سفر (نعتیہ شاعری کے سات سو سال) جلد اول 1999ء

عالمی امن کے موضوع پر لکھی گئی طویل افسانوی نظم "بنگال سے کوریا تک" کے تراجم

1- Flower in Flames (انگریزی) پروفیسر جندر سنگھ ورما (پنجابی یونیورسٹی، پٹیالہ، انڈیا)
2- Flute & Buggle (انگریزی) پرکاش چندر۔ ریذیڈنٹ ایڈیٹر، ٹائمز آف انڈیا، لکھنؤ
3- گل باھہ (سندھی) ایم۔ ای عالمانی (حیدرآباد، سندھ)
4- بنگال سے کوریا تک (ہندی) پروفیسر جی این ندّاف، ابوالکلام آزاد کالج (اورنگ آباد، انڈیا)
5- (تلگو) ڈاکٹر دسرتی۔ (حیدرآباد، انڈیا)

منتخب کلام "حرف حرف روشنی" کے تراجم

1- Every word Aglow (انگریزی) پروفیسر راجندر سنگھ ورما
2- شبد شبد پرکاش (ہندی) قاضی رئیس (اورنگ آباد، مہاراشٹر)
3- حمایت علی شاعر جاڈرامہ (سندھی تراجم)

غیر مطبوعہ کتب

1- آئینہ در آئینہ (منظوم سوانح حیات) دوسرا ایڈیشن
2- چاند کی دھوپ (تازہ مجموعہ کلام)
3- ملاقاتی (ایک نئی صنف سخن)
4- سرگم (گیت اور نغمے)
5- اپنے پرچم تلے (قومی نغمے اور ثنائیے)
6- کبھی ان کبھی (رومانی شاعری)
7- کلام شاعر (کلیات)
8- زاویے (ریڈیائی ڈرامے) منظور و منشور
9- مہران موج (سندھی لوک کہانیوں کا تمثیلی روپ) منظوم و منثور
10- اندھیرے اجالے (اسٹیج ڈرامہ)
11- نقطہ نظر (تجزیاتی مضامین)
12- نئی پود (نئی نسل کے اہل قلم)
13- مسائل و مباحث (مضامین اور خطوط)
14- کچھ پیش رو کچھ ہم سفر (تنقیدی مقالات)
15- لب آزاد (مزاحمتی شاعری کے پچاس لاکھ)
16- نشید آزادی (تحریک آزادی میں اردو شاعر کا حصہ)
17- خوشبو کا سفر (علاقائی زبانوں کے شعراء کا اردو کلام۔ پانچ سو سال)
18- عقیدت کا سفر (پاکستان میں نعتیہ شاعری) جلد دوم

Adarts-HRA-5/2001

Manhattan Leo Burnett

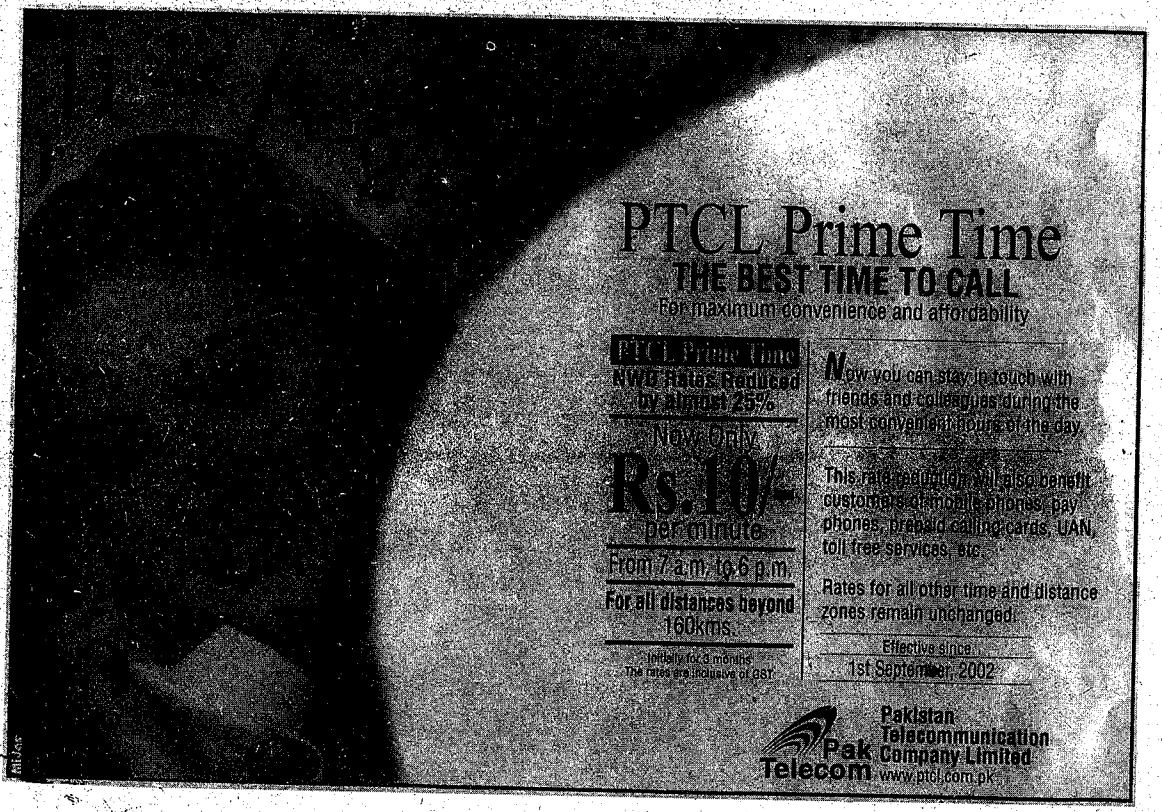
PTCL Prime Time
THE BEST TIME TO CALL
For maximum convenience and affordability
PTCL Prime Time
NWD Rates Reduced by almost 25%
Now Only
Rs.10/-
per minute
From 7 a.m. to 6 p.m.
For all distances beyond 160kms.
Initially for 3 months
The rates are inclusive of GST
Now you can stay in touch with friends and colleagues during the most convenient hours of the day.
This rate reduction will also benefit customers of mobile phones, pay phones, prepaid calling cards, UAN, toll free services, etc.
Rates for all other time and distance zones remain unchanged.
Effective since
1st September, 2002
Pak Telecom
Pakistan Telecommunication Company Limited
www.ptcl.com.pk

محترمہ **رعنا اقبال** کا تعلق ایک علمی و ادبی گھرانے سے ہے۔ آپ کے والد جناب اطہر ضیائی صاحب طرز
نہ مشق شاعر اور متعدد کتابوں کے مصنف ہیں جبکہ بڑے بھائی جناب خالد اطہر معروف صحافی ہیں۔

آپ جامعہ کراچی سے بالترتیب ایم اے اردو ادب، ایم اے ابلاغ عامہ اور ایم اے بین الاقوامی تعلقات کی اسناد
تی ہیں۔ وفاقی گورنمنٹ اردو کالج کراچی کے شعبہ ابلاغ عامہ میں لیکچرار کے عہدے پر فائز ہیں۔ آپ نے متعدد افسانے بھی
لکھے ہیں جبکہ تحقیق و تنقید پر ان کے متعدد مضامین پاکستان و بیرون پاکستان کے اعلیٰ ادبی رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔
ہیں بین الاقوامی شہرت یافتہ شاعر جناب جمیل الدین عالی پر ساڑھے گیارہ سو صفحات پر مشتمل ماہنامہ دنیائے ادب کے ضخیم،
ریخی اور یادگار "جمیل الدین عالی نمبر" کی ادارت کا بھی اعزاز حاصل ہے آج کل آپ دنیائے اردو کے ایک اور اہم شاعر
ناب حمایت علی شاعر پر جامعہ کراچی سے ڈاکٹریٹ کر رہی ہیں۔

آپ دو کتابوں " بارشِ سنگ سے بارشِ گل تک " اور " رشیدہ عیاں۔ فن و شخصیت " کی مرتب بھی ہیں۔